جلد [illegible] جون [illegible] عدد [illegible]

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

۵ اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۷۳ | جون ۱۹۷۰ء ـ مطابق ربیع الاوّل ۱۳۹۰ھ | عدد ۴

ـــ مغربی پاکستان ـــ | ماہنامہ ترجمان القرآن | ـــ مشرقی پاکستان ـــ

سالانہ چندہ: آٹھ روپے | ۵-اے، ذیلدار پارک اچھرہ، لاہور | (بذریعہ ہوائی جہاز)

فی پرچہ: ۸۰ پیسے | فی پرچہ: ۹۰ پیسے سالانہ ۱۰ روپے

عام ڈاک سے: فی پرچہ ۸۰ پیسے سالانہ ۸ روپے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

موجودہ اشتعال انگیز ماحول میں جب کہ جماعت اسلامی کے مخالفین اس کی آواز کو دبانے اور اس کی راہ روکنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہیں اور اس مقصد کے لیے بڑے اوچھے ہتھیاروں اور گھٹیا ہتھکنڈوں کے استعمال پر اُتر آئے ہیں، ہم اپنے رفقاء اور بہی خواہوں سے چند باتیں کہنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنے جذبات کے اندر توازن پیدا کر سکیں اور اپنی صلاحیتوں کو بیکار کاموں میں ضائع کرنے کے بجائے تعمیری کاموں میں لگا سکیں۔

پہلی چیز جس کی طرف ہم انہیں بار بار توجہ دلا چکے ہیں اور اب پھر دلا رہے ہیں وہ یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی کے ساتھ مل کر وہ جو کام کر رہے ہیں وہ کوئی "سیاست بازی" نہیں بلکہ سراسر دین کی خدمت ہے۔ جماعت اسلامی اُن معنوں میں کوئی سیاسی جماعت نہیں ہے جن معنوں میں آج لفظ "سیاست" بولا جاتا ہے۔ مادی تہذیب کی یلغار نے جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں سے شرافت، اخلاق، حق پرستی اور انصاف پسندی کو نیست و نابود کیا ہے وہاں اُس نے سیاست کا بھی حُلیہ بگاڑ دیا ہے۔ اس لفظ کے زبان پر آتے ہی انسان کی توجہ کسی ایسے مذموم اور ناپاک دھندے کی طرف مبذول ہو جاتی ہے جو صرف چالاکی، عیّاری اور مکر و فریب کے بل پر کیا جاتا ہے اور جس میں خلوص، ایمانداری، ایثار اور للّٰہیت نام کی کوئی شے سرے سے موجود ہی نہیں ہوتی۔ دورِ جدید کے سیاسی کاروبار کو دیکھتے ہوئے سیاست کی یہ تصویر کسی اعتبار سے بھی غلط نہیں۔ مادّی تہذیب نے اجتماعی زندگی کی ساری غلاظتوں کو اس میدان میں لا کر جمع کر دیا ہے جن کی وجہ سے پوری فضا میں خوفناک قسم کا تعفّن پھیل گیا ہے۔

اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اخلاق و شرافت کے قدردان نہ تو خود اس متعفن فضا کا رُخ کرنے کی جرأت کرتے ہیں اور نہ دوسروں کی اس جسارت کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اُن کو یہ خوف لاحق ہوتا ہے کہ اِس فضا میں پہنچتے ہی اِس کے اخلاق کُش جراثیم آدمی کے اندر سرایت کر کے اس کے اخلاقی احساسات کو بالکل فنا کر دیں گے۔

یہ سیاسی کاروبار جس کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اور جس سے آج ہر شخص واقف ہے اس سے جماعت کا کوئی دُور کا بھی تعلق نہیں۔ ہم اِس دھندے کو اسلامی نقطۂ نظر سے بالکل غلط اور اخلاق سوز سمجھتے ہیں، اس سے محفوظ رہنے کے لیے خدا کی پناہ مانگتے ہیں، اور اس بات کے آرزومند ہیں کہ پوری انسانیت کو اس سے نجات حاصل ہو۔ جماعت اسلامی اوّل و آخر دینی جماعت ہے اور دین کے تقاضے کے تحت ہی وہ سیاسی میدان میں اُتری ہے۔ اس بنا پر اس کی سیاست سے دلچسپی اُسی حد تک ہے جس حد تک کہ اللہ کا دین مطالبہ کرتا ہے اور وہ فکر و احساس کے اُس مقدس سرمائے کے ساتھ اس میدان میں سرگرمِ عمل ہے جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کرنے والوں کا زادِ راہ ہوتا ہے۔ ہم جس طرح اس بات کے خواہش مند ہیں کہ انسان کے قلب و دماغ میں ایمان کی شمع فروزاں ہو، اس کی انفرادی زندگی اسلامی اخلاق کی جیتی جاگتی تصویر ہو، اس کی معاشرت ہر بُرائی سے پاک ہو، اس کی معیشت ہر قسم کے ناجائز استحصال اور ہر ناانصافی سے محفوظ ہو، بالکل اسی طرح ہم اس بات کے بھی دل و جان سے متمنی ہیں کہ سیاست کے کاروبار سے جھوٹ، مکر و فریب اور ابن الوقتی کی ساری آلائشیں دُور کر کے اُسے خدا خوفی کی بنیاد پر از سرِ نو استوار کیا جائے اور اجتماعی زندگی کا یہ میدان چالاکیوں اور عیاریوں کا ناٹک پیش کرنے کے بجائے شرافت، پاسِ عہد، اصول پرستی اور ایثار کا نقشہ پیش کرے۔ لوگ اس میدان میں اُسی احساسِ ذمہ داری کے ساتھ اتریں جس کے ساتھ وہ پانچوں وقت خدا کے حضور میں پیش ہوتے ہیں۔

ہمارے رفقاء کو کسی مرحلے میں بھی عام "سیاست بازی" اور جماعت کی سیاسی جدوجہد کے مابین اس عظیم فرق کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ہم اس کام میں کوئی دنیوی فوائد حاصل کرنے یا حکومت پر

قبضہ کرکے اپنے لیے یا اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کے لیے مختلف قسم کی جائز و ناجائز مراعات حاصل کرنے کے لیے سرگرمِ عمل نہیں ہوئے۔ اِس میدان میں ہماری جدوجہد کا مقصد یہ ہے کہ قوت و طاقت کے اُس عظیم سرچشمے کو، جو اجتماعی زندگی کی تشکیل میں سب سے زیادہ مؤثر کردار ادا کرتا ہے، ہر قسم کی غلاظتوں اور آلائشوں سے پاک کیا جائے اور اس سے حیاتِ انسانی کے سارے شعبوں کو سیراب کرنے کا کام لیا جائے۔

ظاہر بات ہے کہ جو افراد بھی ان غلاظتوں کو دُور کرنے اور تعفّن کی اس زہریلی فضا کو پاک کرنے کے لیے عملی طور پر آگے بڑھیں اُن کے لیے نہ صرف یہ بات ضروری ہے کہ وُہ ہر لمحہ اپنے مقصد کی عظمت کو سامنے رکھیں بلکہ اُن کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وُہ اِس مسموم فضا کے ہلاکت خیز اثرات سے خود اپنے آپ کو بچانے کے لیے تمام مؤثر تدابیر اختیار کریں۔ اس سلسلے میں اُن کی پہلی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وہ دینی اعتبار سے خود اچھی طرح صحت مند ہوں۔ کیونکہ اگر وہ خود ایمان و عمل کے لحاظ سے تندرست و توانا نہ ہوں گے تو وہ مسموم فضا میں پھیلے ہوئے جراثیم کے حملوں کا اچھی طرح مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ ہنگامی حالات میں عملاً یہ مشکل ہوتا ہے کہ جماعت اس کے لیے تربیت گاہیں قائم کرے۔ مگر انہیں خود اپنی تربیت کے فرض سے کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔ انہیں وہ تمام تدابیر اختیار کرنی چاہییں جن سے اُن کے ایمان مضبوط اور اعمال صالح ہوں اور ان کے اندر اخلاص اور صبر و ثبات کی قوت پیدا ہو۔ قرآن و حدیث اور سیرتِ نبویؐ کے مطالعے کے اہتمام کے ساتھ ساتھ انہیں صحابہ رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین کی سیرتوں کا بھی مطالعہ کرتے رہنا چاہیے۔

دوسرے، اس مقدس جدوجہد کی خاطر میدانِ عمل میں اُترتے وقت انہیں اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ وہ کسی عام دنیوی انقلاب کے لیے سرگرمِ عمل نہیں ہیں بلکہ اس عظیم روحانی اور اخلاقی انقلاب کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں جو انبیاء علیہم السلام جیسی عظیم اور مقدس ہستیوں کے

ہاتھوں برپا ہوا اور سلسلۂ نبوت ختم ہو جانے کے بعد جلیل القدر صلحائے امت جس کے لیے مسلسل تگ و دو کرتے رہے۔ میرے ایک نہایت ہی واجب الاحترام بزرگ، جو اب دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور اپنی نیکی اور پرہیزگاری کے اعتبار سے سلف صالحین کا نمونہ تھے، انھوں نے ایک مرتبہ تحدیثِ نعمت کے طور پر بڑے بے ساختہ انداز میں یہ فقرہ کہا: ”دنیا میں اس سے بڑا اعزاز اور اس سے بڑی خوش نصیبی کسی انسان کے لیے اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے مشن کو دنیا میں سربلند کرنے کی کوشش کر رہا ہے“۔ مادہ پرستی کے اس دور میں جب انسانوں کی عظیم اکثریت زندگی کے ہر معاملے کو مادی سُود و زیاں کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی عادی ہے، اگر کچھ لوگ اُخروی فلاح و کامرانی کو زندگی کا اصل مقصود و مطلوب قرار دے کر جدوجہد کریں تو یہ اس گروہ پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے جس کے لیے اس کا جس قدر بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ اس وقت جب کہ لوگوں کو دنیوی لذتوں نے بالکل مدہوش کر دیا ہے وہ اس گروہ کو اپنا حریف سمجھ کر اُسے بالکل مٹانے پر تُلے ہوتے ہیں، مگر انہیں اپنے اس فیصلے کی غلطی کا جلد ہی احساس ہو جائے گا اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ انسانیت کی اخلاقی صحت کے لیے اس گروہ کا وجود کتنی بڑی نعمت ہے۔

جو شخص جسمانی اعتبار سے علیل ہو وہ خود طبیب کے پاس چل کر آتا ہے اور اس سے مشورہ طلب کرتا ہے۔ مگر جو لوگ روحانی اور اخلاقی امراض میں مبتلا ہوتے ہیں اُن کی فکر اس قدر مفلوج ہو جاتی ہے کہ وہ خود اپنے دشمن بن کر اپنے آپ کو تباہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے حقیقی بہی خواہوں کو اپنا بدخواہ اور اپنے بدخواہوں کو اپنے بہی خواہ خیال کرنے لگتے ہیں۔ غور کیجیے کہ وہ لوگ کس قدر بے نفس، صابر اور معتدل مزاج ہوں گے جو ان روحانی اور اخلاقی مریضوں کی صحت کے لیے سرگرمِ عمل ہوں۔ یہ معالج اس انتظار میں نہیں رہتے کہ مریض اُن کی طرف رجوع کریں اور پھر وہ اُن کی صحت کی بحالی کے لیے کوشش کریں، بلکہ یہ بڑی دل سوزی کے ساتھ مریضوں کی طرف لپکتے ہیں اور اُن کی ساری نادانیوں کے باوجود اُن کے اندر سوئی ہوئی شرافت اور خدا خوفی کو بیدار کرکے

انہیں روحانی اعتبار سے صحت مند بنانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔

پاکستان ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں انسانوں کی بہت بڑی اکثریت ان روحانی اور اخلاقی عوارض میں مبتلا ہے اور ان کے خطرناک نتائج بھی اس کے سامنے کھل کر آ گئے ہیں۔ مگر مادہ پرستی کے اس روگ نے اس کے اندر شعور کو بالکل ختم کر دیا ہے اور اُسے اس امر کا قطعاً احساس نہیں ہو رہا کہ وہ کس قدر سرعت کے ساتھ تباہی کی طرف جا رہی ہے۔ ان حالات میں انسانوں کا جو گروہ بھی ان عوارض کو دُور کرنے کے لیے جدوجہد کرے گا اُسے ناقابلِ بیان مشکلات سے سابقہ پیش آئیگا۔

ہمارے بعض رفقاء ان مشکلات کو دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں۔ مگر انہیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ ساری مشکلات اس راہ کی فطری دشواریاں ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بات بھی انہونی نہیں۔ خدا مطلق ہم جیسے کم مایہ اور بے بضاعت اور کمزور عزم و ارادے والے آدمیوں کو اپنی پناہ میں رکھے، مگر تاریخ کے مطالعے سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ بگڑے ہوتے معاشرے کی اخلاقی اور روحانی اصلاح یا دوسرے لفظوں میں انسانوں کو حیوانیت کی پست سطح سے اٹھا کر انسانیت کی اصلی سطح پر لے آنا دنیا کا سب سے مشکل، سب سے زیادہ صبر آزما اور سب سے زیادہ محنت طلب کام ہے۔ اس راہ میں انسانیت کے بہی خواہوں نے گالیاں کھائیں، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، گھر بار لٹایا اور بعض حالات میں بڑی اذیت کے ساتھ جانیں بھی قربان کیں۔ جو فرد یا گروہ انسانیت کے حقیقی مقام کو کھو دیتا ہے اس کے لیے پھر کوئی برائی برائی نہیں رہتی۔ وہ انسانیت کے اصلی بہی خواہوں کو ہر طرح سے ستاتا اور پریشان کرتا ہے۔ جو شخص حق و صداقت کی راہ چھوڑ کر اپنی ہی دشمنی پر آمادہ ہو جاتا ہے اس سے کسی دوسرے شخص کی عزت و آبرو اور جان و مال کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں؟ اس وقت جماعت اسلامی کے خلاف جس قسم کی الزام تراشیاں اور دست درازیاں ہو رہی ہیں وہ اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے کوشش کرنے کا بالکل فطری ردِ عمل ہے جس پر ہمیں کبھی برافروختہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ جو اشخاص ہمیں نقصان پہنچانے کے درپے ہیں ان کے حق

ہیں بھی اسی اخلاص اور دلسوزی کے ساتھ دُعا کرنی چاہیے جو ہمیں حضورِ سرورِ کائنات دو عالم کی اس دُعا میں ملتی ہے:

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ اے اللہ! میری قوم کے لوگوں کو معاف فرمائے کیونکہ وہ جانتے نہیں ہیں۔

ایک دوسرے مقام پر مغفرت کے بجائے قادرِ مطلق سے قوم کے لیے ہدایت کی استدعا کی گئی ہے۔

قاضی عیاض نے اپنی کتاب الشفا میں اس دُعا کے کئی ایک مضمرات بیان کیے ہیں: یہ دعا حضورِ سرورِ کائنات کی نوعِ انسانی سے غایت درجہ محبت اور گم کردہ راہ لوگوں کے لیے ہدایت کی گہری آرزو اور تمنا کی آئینہ دار ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ سے حلم اور صبر کے مقدس جذبات جھلکتے ہیں اور اپنے مخالفین کے خلاف کینہ، بغض اور عداوت کی جگہ بے مثال رحم اور شفقت کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ اور پھر انھیں اللہ کے غضب سے بچانے کے لیے خود اُن کی طرف سے یہ عذر بھی بارگاہِ الٰہی میں پیش کر دیا گیا ہے کہ یہ لوگ حقیقتِ حال سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ایسی ناپسندیدہ حرکات کر رہے ہیں، اس لیے انھیں معاف کر دیا جائے۔

عفو و درگزر، صبر و تحمل اور بردباری جیسی اعلیٰ صفات جس تناسب سے ہم اپنے اندر پیدا کر سکیں گے اسی نسبت سے ہم دنیا میں فائز المرام اور آخرت میں کامیاب و کامران ہوں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب ہمارے خلاف جھوٹ کا طوفان اٹھایا جاتا ہے اور طرح طرح کی غلط باتیں ہماری طرف منسوب کر کے ہمیں رُسوا و بدنام کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو ہمارے اندر جھنجلاہٹ پیدا ہوتی ہے۔ مگر ہمیں ان بے ہودگیوں پر صبر کر کے اجر کی امید رکھنی چاہیے اور اس حقیقت کو ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ قدرت کا یہ نظام یونہی کسی اندھی قوت کے اشارے پر نہیں چل رہا ہے بلکہ اسے ایک ایسی بصیر و خبیر اور عادل و صاحبِ اختیار ہستی چلا رہی ہے جو نہ صرف ہر قسم کی زیادتیوں کو اچھی طرح

جانتی ہے بلکہ انصاف کرنے اور ظالم کو سزا دینے کی بھی پُوری پوری قوت رکھتی ہے۔

ہم اپنے رفقاء کو اس مرحلے پر قرآن مجید کی یہ آیت پیش نگاہ رکھنے کی تلقین کرتے ہیں:

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ ... (طٰہٰ، ۱۳۰)

صبر کرو اُن باتوں پر جو یہ لوگ بناتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔

صبر کے لغوی معنی رہ کنے اور سہنے کے ہیں، یعنی اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا اور اس کو اپنی جگہ ثابت قدم رکھنا، یہی صبر کی معنوی حقیقت ہے۔ صبر کے معنی بے اختیاری کی خاموشی اور انتقام نہ لے سکنے کی مجبوری نہیں بلکہ پامردی، دل کی مضبوطی، اخلاقی جرأت اور ثباتِ قدم کے ہیں۔ اشتعال انگیز حالات میں قوت وطاقت رکھنے کے باوجود اپنے آپ کو بے قابو نہ ہونے دینا صبر ہے۔ مخالفین کی زیادتیوں اور اتہام تراشیوں کو سکونِ خاطر کے ساتھ نظر انداز کر دینا صبر ہے۔ قرآنِ مجید نے اس حقیقت کی طرف یُوں اشارہ کیا ہے:

وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا۔ (مزمل-۱۰)

ان کی باتوں پر صبر کرو اور خوبصورتی کے ساتھ ان سے الگ ہو جاؤ۔

صبر راہِ خدا میں جد وجہد کے لیے ایک لازمی صفت ہے۔ دنیا میں آج تک بھلائی کی اشاعت اور اس کے نفاذ کو کبھی بھی دنیوی مفاد کے پرستاروں نے آسانی سے برداشت نہیں کیا۔ بگاڑ کے علمبرداروں نے اس کی ہمیشہ پُوری شدت کے ساتھ مخالفت کی ہے اور جو لوگ اس راہ میں نکلے ہیں اُن پر ہر قسم کے مظالم ڈھاتے ہیں۔ ان حالات میں اگر اہلِ خیر صبر کا دامن چھوڑ دیں تو وہ اپنے مقدس مشن کی تکمیل نہیں کر سکتے۔

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ، اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ

جو شخص اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد انتقام لے اس پر کوئی گرفت نہیں۔ گرفت ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور ملک میں ناحق فساد کرتے ہیں۔

الْحَقِّ ؕ اُولٰٓئِکَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۔ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِکَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (شوریٰ ۴۲:۴۳)

ایسے ہی لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ البتہ جس نے صبر کیا اور معاف کر دیا تو بے شک یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔

اللہ کے دین کی سربلندی کا کام کوئی پھولوں کی سیج نہیں جسے کوئی فرد یا گروہ کوئی تکلیف اٹھائے بغیر سر انجام دے سکے۔ جب کوئی شخص نیکی کا حکم دیتا ہے تو منکرات کے سارے ایوانوں میں دھماکہ پیدا ہوتا ہے اور وہ سب مل کر حق کے خلاف یلغار کرتے ہیں۔ اسی طرح جب کوئی شخص برائی سے روکتا ہے تو برائیوں کا ارتکاب کرنے والے اسے اپنے خلاف ایک خوفناک چیلنج سمجھ کر اس کے مقابلے میں آ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے وقت مختلف قسم کے مصائب کا پیش آنا بالکل فطری امر ہے اور انہیں ثابت قدمی کے ساتھ برداشت کرنا بھی دینِ حق کا ایک تقاضا ہے۔

وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ

نیکی کا حکم کر اور برائی سے روک اور جو مصیبت پیش آئے اس پر صبر کر، یہ بڑے حوصلے کے کاموں میں سے ہے۔

قرآن مجید نے راہِ خدا میں نکلنے والوں کے لیے اخلاص، توجہ الی اللہ، صبر و ثبات کی جو بار بار تلقین کی ہے اس کی ایک وجہ تو وہ ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ مگر اس کی دوسری وجہ انسانی فطرت کی ایک بہت بڑی کمزوری کے بارے میں احساس دلاتا ہے۔ انسان جب کوئی جد و جہد کرتا ہے تو اس کے اندر فطری طور پر یہ خواہش موجزن ہوتی ہے کہ اس کے ثمرات کو وہ جلد ہی اپنی جھولی میں ڈال لے۔ مگر جب اسے اس صبر آزما اور مشکل کام میں بظاہر کامیابی ہوتی نظر نہیں آتی تو وہ بسا اوقات کسی سستے نسخے کو آزما کر کامیابی سے ہمکنار ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے

کہ بے صبری اس سے ایسے غلط کام کروا ڈالتی ہے جو اصل مقصد کے منافی بھی ہوتے ہیں اور اس کے لیے نقصان دہ بھی۔ قرآن مجید نے اسی لیے صبر کی تلقین کے ساتھ جلد بازی سے روکا ہے:

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِل لَّهُمْ (احقاف: ۳۵)	پس صبر کرو جس طرح اولوا العزم رسولوں نے صبر کیا ہے اور مخالفوں کے معاملہ میں جلدی نہ کرو۔

مقصد اور ذرائع کے باہمی تعلق کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مقدس مقاصد مقدس ذرائع کی مدد ہی سے حاصل کیے جاتے ہیں اور یہ کبھی نہیں ہوتا کہ مقصد تو نیک ہو مگر حاصل اُسے ناپاک ذرائع سے کیا جاتے۔ اسلام کے نزدیک انسانی زندگی کا سب سے بڑا مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ مقصد للہیت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر ذرائع ناپاک ہوں تو ممکن ہے کہ انسان دنیوی اعتبار سے بظاہر کامیاب ہوتا نظر آئے، مگر دینی اعتبار سے ناکام ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان کی کامیابی کا دارومدار ظاہری کامیابی پر نہیں بلکہ خلوص نیت، راست بازی اور اللہ کی رضا پر ہے۔ اگر اس نے کامیابی کی بے جا خواہش اور تمنا میں اخلاقی اقدار کو نظرانداز کر دیا تو وہ کامیاب ہونے کے باوجود ناکام و نامراد رہا۔ لیکن اگر اُس نے اس جدوجہد میں حق و صداقت کا دامن نہ چھوڑا اور مشکلات و مصائب کے باوجود جادۂ مستقیم پر گامزن رہا تو وہ ہر لحاظ سے کامیاب ہی ہے، چاہے ظاہر بیں آنکھوں کی نظر میں وہ ناکام ہو۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کی طرف مختلف انداز میں اشارہ کیا ہے۔ مثلاً سورۂ حٰمٓ السجدہ میں فرمایا گیا ہے:

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّن دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ (۳۳)	اور اس سے زیادہ اچھی بات اور کس کی ہو سکتی ہے جس نے اللہ کی طرف بلایا اور خود نیک کرداری اختیار کی اور کہا کہ میں اللہ کے فرماں برداروں میں سے ہوں۔

یعنی سب سے اچھی بات اُس بندۂ خدا کی ہے جو ایمان و عمل کا ذاتی سرمایہ رکھنے کے ساتھ اللہ کے

دوسرے بندوں کو بھی اُس کی طرف بلاتا ہے اور اُن کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے اور اس راہ میں جان کھپاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت اسی بات کی متقاضی ہے کہ داعی کے اپنے اعمال نیک ہوں اور وہ خود اپنے مالک و خالق کا فرماں بردار بندہ ہو کیونکہ اگر اس کی اپنی زندگی اطاعتِ الٰہی سے مزین نہ ہوگی تو اس کی دعوت الی الخیر میں کیا اثر ہوگا؟

مقصد کی پاکی کے ساتھ ذرائع کی پاکی اسلام کا ایک ایسا تابناک اور امتیازی پہلو ہے جو ایک مسلمان کی جدوجہد کو اوّل سے لے کر آخر تک روحانیت کے نُور سے منور کر دیتا ہے۔ یورپ کے حکما نے اہلِ یورپ کو جو فلسفۂ اخلاق دیا ہے اُس کی رُو سے مقصد اور ذریعہ کے دو الگ الگ شعبے ہیں۔ انہیں مادّی فلسفۂ حیات نے یہ تعلیم دی ہے کہ اصل چیز مقصد کا حصول ہے اور اسے جائز و ناجائز جس طریقے سے بھی حاصل کیا جا سکے، حاصل کر لینا چاہیے۔ اس فلسفے کو پُوری قوت کے ساتھ یورپ کے بہت سے مفکرین نے پیش کیا ہے، جن میں میکیاولی سرِفہرست ہے۔ اس شخص نے اس باطل فلسفہ کا پرچار کر کے یورپ کے اخلاق کو جس طرح بگاڑا ہے اس کا پُوری طرح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اسی باطل پرست "فلارنساوی حکیم" کی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ حیلہ بازی، موقع پرستی، مکروفریب سب کو سندِ جواز مل گئی ہے، جھوٹ اور سچ کو ایک ہی مقام پر لاکھڑا کر دیا گیا ہے اور اس فلسفے کی وجہ سے سیاست کے اندر غیر شریفانہ اور غیر اخلاقی حرکات کا عام چلن ہوا ہے۔

اسلام کا اس معاملے میں اصول یہ ہے کہ کوئی مقصد جس ذریعے سے حاصل ہوتا ہے وہ ذریعہ خود اس مقصد کا ایک حصّہ ہے۔ اسلام نے اپنی مقدس منزل تک پہنچنے کے لیے جو راستہ اور انداز تجویز کیا ہے وہ خود بھی اتنا ہی مقدس اور پاکیزہ ہے جتنی کہ خود منزل۔ کیونکہ اسلام کے پیشِ نظر یہ بنیادی حقیقت بھی ہے کہ کوئی فرد یا گروہ جس راہ سے، فکر و احساس کے جس جذبے اور جس حوصلے اور نیّت اور عزم کے ساتھ کسی منزل کی طرف بڑھتا ہے، اُن سب کا منزل کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اسلام اس بات کو

اصولاً غلط اور فطرت کے منافی سمجھتا ہے کہ کوئی فرد یا گروہ غیر اخلاقی حرکات کی مدد سے کوئی بلند اخلاقی اور روحانی نصب العین حاصل کر سکے۔ قرآن مجید نے کئی ایک مقامات پر اس حقیقت کی صراحت فرمائی ہے:

وَالَّذِیْنَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً وَّیَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ۔ (رعد: ۲۲)

اور جنہوں نے اپنے پروردگار کی خاطر صبر کیا اور نماز قائم کی اور جو رزق ہم نے ان کو عطا کیا ہے اس میں سے چھپے اور علانیہ (راہِ خدا میں) خرچ کیا اور جو برائی کو نیکی سے دفع کرتے ہیں ان کے لیے آخرت کا انجام ہے۔

یہ آیت مقصد اور ذریعہ کے باہمی تعلق اور ان دونوں کی تقدیس پر نہایت واضح الفاظ میں روشنی ڈالتی ہے۔ اس آیت کی رُو سے خدا کے مخلص بندے کی پہچان یہ ہے کہ وہ سب سے زیادہ خدا کی رضا کا طالب ہوتا ہے اور اس راہ میں ثابت قدم رہ کر جدوجہد کرتا ہے اور جو مصائب اُسے پیش آئیں انھیں صبر کے ساتھ برداشت کرتا ہے۔ اس مقدس جدوجہد کو کامیابی کے مراحل تک پہنچانے کے لیے سب سے اہم فرض نماز ہے۔ نماز کے ذریعے ہی اپنے رب کا قرب حاصل کیا جا سکتا ہے۔ دوسری چیز انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو انسان کے دل سے حرص، لالچ، بخل اور دنیوی مال و متاع کی محبت نکال کر اس کے اندر اللہ کی محبت پیدا کرتا ہے۔ اس عمل سے اُسے راہِ خدا میں خلوص نیت کے ساتھ ایثار کرنے کی تربیت ملتی ہے۔ اور اسی ضمن میں آخری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ ایک مومنِ صادق بُرائی کو نیکی سے دفع کرتا ہے۔ برائی کا مٹانا ایک بھلائی کا کام ہے۔ خدا کا بندہ اس بھلائی کے کام کو بھلائی ہی سے سرانجام دیتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ اس بھلائی کے کام کو بُرائی کے ساتھ سرانجام دے تو اس کے مقدس مشن کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اس آیت کا آخری جملہ "ان کے لیے آخرت کا انجام ہے" بڑا معنی خیز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں خواہ مومن کو کامیابی نصیب نہ ہو مگر آخرت کی کامیابی جو درحقیقت اس کی جدوجہد کی غایتِ اُولیٰ ہے وہ اُسے ضرور حاصل ہو جاتی ہے۔

ایک مومن کا مطلوب و مقصود جب رضائے الٰہی ہے جو سچے اور گہرے ایمان و ایقان اور پاکیزہ اعمال ہی سے حاصل ہو سکتی ہے، تو خدا کا مخلص بندہ اس کے حصول کے لیے آخر ناپسندیدہ ذرائع کے استعمال کے بارے میں کس طرح سوچ سکتا ہے؟

ایک مسلمان کے لیے سیاسی جدوجہد، معاشی تگ و دو، معاشرتی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش اور علم کے حصول کے لیے محنت، کوئی ایک کام بھی منتہائے مقصود نہیں بلکہ یہ سارے کام رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ اس بنا پر ان سارے کاموں کو اسی احساسِ ذمہ داری اور خلوصِ نیت سے ادا کرنا چاہیے جس طرح کہ ایک انسان دینی فریضے کو ادا کرتا ہے۔ سیاسی جدوجہد سے اس کا مقصد اپنی قوم یا اپنے ملک یا اپنے قبیلے یا خود اپنی ذات کی سربلندی نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کے پیچھے اللہ کے دین کو دنیا میں سربلند اور غالب کرنے کا جذبہ کارفرما ہونا چاہیے۔ اسی طرح معاشی تگ و دو سے اس کا مقصود اپنی ذات یا برادری کے لیے زیادہ سے زیادہ معاشی منافع سمیٹنے کے بجائے انھیں خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی سچی اور گہری آرزو ہونی چاہیے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید نے اپنے بلیغ انداز میں یوں فرمایا ہے:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَ	کہہ دو کہ میری نماز اور میرے تمام مراسمِ عبودیت،
مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔	میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العٰلمین کے
(الانعام: ۱۶۲)	لیے ہے۔

یہ ہے نہایت مختصر مگر جامع الفاظ میں ایک مومن کی زندگی کا مقصد اور اس کا صحیح طرزِ عمل۔ اس کی عبادت اور مذہبی اعمال، اس کی زندگی اور اس کی موت سب کا منتہائے مقصود خدا کی خوشنودی ہونی چاہیے۔ اس بنا پر وہ سارے ذرائع جن کی مدد سے ایک مسلمان اس مقصود کو حاصل کرتا ہے وہ بھی بندگیِ رب میں شامل ہیں۔

مغرب میں مقصد اور ذریعہ کو الگ الگ سمجھنے کا جو غلط تصور رائج ہے اس کی بنیاد دین و دنیا کی وہ تفریق ہے جس کی ابتدا کلیسا نے کی اور جسے بعد میں مغرب کے مادہ پرست مفکرین نے قوت بہم پہنچائی۔ مگر یہ مفکرین اپنے سارے علم و فضل کے باوجود اتنی سادہ سی حقیقت نہیں سمجھ سکے کہ جس نصب العین کو مقدس سمجھا جاتا ہے وہ خود دوسرے بہت سے مقاصد سے عبارت ہوتا ہے جس میں ذرائع بھی شامل ہوتے ہیں۔ فکری اور نظری اعتبار سے ممکن ہے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی تفریق کی جا سکے مگر عملی جدوجہد میں مقصد اور ذریعہ کے درمیان امتیاز نہیں کیا جا سکتا اور جو لوگ اس طرح کی کوشش کرتے ہیں وہ اپنے لیے بہت سی الجھنیں پیدا کر لیتے ہیں۔ اس امر کی وضاحت کے لیے یوں تو کئی ایک مثالیں دی جا سکتی ہیں، مگر میں صرف دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔ اسلام کے نظامِ عبادات پر نگاہ ڈالیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ پانچوں فرائض ذرائع اور مقاصد دونوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب ہم زندگی کا اصل مقصود رضائے الٰہی کو قرار دیتے ہیں تو یہ مذہبی فریضے اُسی مقصد کے حصول کا ذریعہ بنتے ہیں۔ مگر جب فرائض کی ادائیگی کو مقصدِ حیات ٹھیراتے ہیں تو جن وسائل سے ہم یہ فرائض سر انجام دیتے ہیں ان کی حیثیت ذرائع کی بن جاتی ہے۔ مثلاً حج رضائے الٰہی کے حصول کا ایک ذریعہ بھی ہے، مگر یہی فریضہ جب مقصد بنتا ہے تو مال و دولت ذریعہ بن جاتی ہے جس کی مدد سے اس فرض کو سر انجام دیا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح سیاسی جدوجہد کی مختلف کڑیاں ایک نقطۂ نظر سے مقاصد اور دوسرے نقطۂ نظر سے ذرائع کی حیثیت اختیار کر سکتی ہیں۔ مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم اس دنیا میں اللہ کے دین کو غالب کرنا چاہتے ہیں تو سیاست کی حیثیت ذریعہ کی سی ہوتی ہے کیونکہ سیاسی قوت اس عظیم مقصد کی تکمیل کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ مگر دوسرے نقطۂ نگاہ سے جب اجتماعی زندگی کو اسلامی اصولوں میں ڈھالنے کے لیے سیاسی جدوجہد کی جاتی ہے تو یہ فرض بذاتِ خود مقصد دکھائی دینے لگتا ہے اور انتخابات میں کامیابی کے لیے سعی و جہد، رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے تگ و دو، یہ سب کام ذرائع کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ غالباً اسی بنیادی حقیقت کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے بعض لوگ جماعت

اسلامی کی سیاسی جدوجہد اور اس کی نوعیت کو پوری طرح سمجھ نہیں سکتے، اور اسے ایک سیاسی جماعت کہہ کر اس کے دینی مرتبہ و مقام کو گرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسلام نے جب مذہب اور سیاست کے درمیان کوئی تفریق روا نہیں رکھی تو ہم آخر یہ جسارت کس طرح کر سکتے ہیں۔ اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ جن کاموں کو دنیا غیر مذہبی کام سمجھتی ہے ان کو اس نے مذہب کے تابع کر کے اور انہیں اخلاقی حدود کا پابند بنا کر اور ان کے اندر روحانیت کا نور بھر کر حیاتِ انسانی کو ایک فطری وحدت عطا کی ہے۔ یہ وحدت اسی صورت میں برقرار رہ سکتی ہے جب زندگی کے ہر شعبے میں اور ہر گام اور ہر قدم پر دینی ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس کیا جاتے۔

فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا (الحج ۳۴) پس تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے لہٰذا اسی کے تم فرمانبردار بنو۔

گذشتہ صفحات میں ہم نے جماعت کے رفقاء کو جن امور کی طرف توجہ دلائی ہے ان کا زیادہ تر تعلق قلب و دماغ سے ہے۔ یہاں ہم چند باتیں عملی جدوجہد کے سلسلے میں بھی ان کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

اس سلسلہ میں پہلی چیز تدبر ہے یعنی انہیں ہر کام سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے اور اس بات کو ہمیشہ نگاہ میں رکھنا چاہیے کہ ان کی جدوجہد زیادہ سے زیادہ بہتر نتائج پیدا کر سکے اور ان کی محنت کا کسی طور بھی زیاں نہ ہو۔ یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ معاشرے کے اجزائے ترکیبی اور اس کے مختلف طبقات کے احساسات و رجحانات سے پوری طرح واقف ہوں تاکہ ہر طبقے تک اپنی دعوت بڑی کامیابی کے ساتھ پہنچا سکیں۔ معاشرے کے جو نفسیاتی تجزیے کیے گئے ہیں انہیں دیکھتے ہوئے ایک انسان اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ عموماً ایک معاشرے میں پانچ فیصد ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو حق و صداقت کی آواز سنتے ہی اس پر دل و جان سے لبیک کہتے ہیں اور پھر اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے گریز نہیں کرتے۔ ۵ فیصد طبقہ ٹیڑھے ٹیڑھے دماغ کا مالک ہوتا ہے اور کوئی صحیح بات اس کے دماغ میں اترتی ہی

نہیں سکتی۔ یہ طبقہ ہر صحیح چیز کی مخالفت کرتا ہے۔ معاشرے کے باقی نوے فیصد افراد پر خاموش اکثریت (SILENT MAJORITY) کا اطلاق ہوتا ہے جس کی حیثیت خاموش تماشائی کی سی ہوتی ہے۔ اگر حق و صداقت منظم ہوکر قوت حاصل کرلے تو یہ طبقہ اس کے ساتھ شامل ہوجاتا ہے اور اگر باطل غالب قوت بن جائے تو یہ اس کی اطاعت و فرمانبرداری میں لگ جاتا ہے۔

پھر اس "خاموش اکثریت" میں بھی کئی طبقے پائے جاتے ہیں مگر بہت بڑا طبقہ ان افراد پر مشتمل ہوتا ہے جنہیں دنیوی مفادات سب سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔ یہ لوگ دراصل دنیوی مال و متاع کی پرستش کرتے ہیں اور جس طرف انہیں یہ زیادہ مقدار میں حاصل ہوتا نظر آئے اس کی طرف جھک جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض افراد بڑے شد و مد کے ساتھ اخلاق و روحانیت کی باتیں کرتے ہیں مگر ان کی عملی زندگی اخلاقی اقدار سے یکسر عاری ہوتی ہے۔ تاہم اس خاموش اکثریت میں ایک معقول تعداد ان افراد کی بھی پائی جاتی ہے جو محض غلط فہمی کی بنا پر حق و صداقت کی مخالفت کرتے ہیں اور اگر صحیح بات ان کی سمجھ میں آجائے تو پھر وہ نہ صرف مخالفت سے باز آجاتے ہیں بلکہ حق کے علمبرداروں کا ساتھ دینے کے لیے بھی تیار ہوجاتے ہیں۔

ہمارے رفقاء کو دعوتِ دین کے معاملے میں اس بات کی پوری کوشش کرنی چاہیے کہ اپنی بات زیادہ مؤثر انداز میں معاشرے کے اُس پانچ فیصد طبقہ تک پہنچائیں جو حق و صداقت کی حمایت کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے اور جب بھی کسی طرف سے کوئی بھلائی کی آواز بلند ہو تو آگے بڑھ کر اس کا ساتھ دیتا ہے۔ اس ذیل میں سوال کیا جاسکتا ہے کہ آخر ہم اس طبقے کو کس طرح پہچانیں؟ اس سوال کا جواب بالکل آسان ہے۔ چند صفات ایسی ہیں جن سے یہ طبقہ بڑی آسانی کے ساتھ پہچانا جاسکتا ہے۔

(۱) اس طبقے کے افراد کو دنیوی مال و متاع سے کوئی زیادہ محبت نہیں ہوتی اور وہ اصولوں کی خاطر اپنے مفاد کو بڑی آسانی کے ساتھ قربان کرسکتا ہے۔ اسے مال و اسباب اور (باقی ص ۶۲ پر)

تفہیم القرآن

الجن

نام | "الجن" اس سورہ کا نام بھی ہے اور اس کے مضامین کا عنوان بھی، کیونکہ اس میں جنوں کے قرآن سن کر جانے اور اپنی قوم میں اسلام کی تبلیغ کرنے کا واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول | بخاری اور مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چند اصحاب کے ساتھ بازارِ عکاظ تشریف لے جا رہے تھے، راستے میں نخلہ کے مقام پر آپؐ نے صبح کی نماز پڑھائی، اُس وقت جنوں کا ایک گروہ اُدھر سے گزر رہا تھا، تلاوت کی آواز سن کر وہ ٹھیر گیا اور غور سے قرآن سنتا رہا۔ اسی واقعہ کا ذکر اِس سورہ میں کیا گیا ہے۔

اکثر مفسّرین نے اس روایت کی بنا پر یہ سمجھا ہے کہ یہ حضور کے مشہور سفرِ طائف کا واقعہ ہے جو ہجرت سے تین سال پہلے ۱۰ نبوی میں پیش آیا تھا لیکن یہ قیاس متعدد وجوہ سے صحیح نہیں ہے۔ طائف کے اُس سفر میں جنوں کے قرآن سننے کا جو واقعہ پیش آیا تھا اس کا قصہ سورۂ اَحقاف آیات ۲۹-۳۲ میں بیان کیا گیا ہے۔ اُن آیات پر ایک نگاہ ڈالنے ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اُس موقع پر جو جن قرآن مجید سن کر ایمان لائے تھے وہ پہلے سے حضرت موسیٰ اور سابق کتبِ آسمانی پر ایمان رکھتے تھے۔ اس کے برعکس اِس سورہ کی آیات ۲-۷ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس موقع پر قرآن سننے والے جن مشرکین اور منکرینِ آخرت

و رسالت میں سے تھے۔ پھر یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ طائف کے اُس سفر میں حضرت زیدؓ بن حارثہ کے سوا اور کوئی حضورؐ کے ساتھ نہ تھا۔ بخلاف اِس کے اِس سفر کے متعلق ابنِ عباس فرما رہے ہیں کہ اِس میں چند صحابہ آپ کے ساتھ تھے۔ مزید برآں روایات اِس بات پر بھی متفق ہیں کہ اُس سفر میں جنوں نے قرآن اُس وقت سنا تھا جب حضورؐ طائف سے مکّہ واپس تشریف لاتے ہوئے نخلہ میں ٹھیرے تھے۔ اور اس سفر میں ابن عباس کی روایت کے مطابق جنوں کے قرآن سننے کا واقعہ اُس وقت پیش آیا جب آپ مکّہ سے عُکاظ تشریف لے جا رہے تھے۔ اِن وجوہ سے صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ سورۂ احقاف اور سورۂ جن میں ایک ہی واقعہ کا ذکر نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ دو الگ واقعات تھے جو دو مختلف سفروں میں پیش آئے تھے۔

جہاں تک سورۂ احقاف کا تعلق ہے، اس میں جس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے اس کے بارے میں روایات متفق ہیں کہ وہ ۱۰ نبوی کے سفر طائف میں پیش آیا تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ دوسرا واقعہ کس زمانے میں پیش آیا، اس کا کوئی جواب ہمیں ابن عباس کی روایت سے نہیں ملتا، نہ کسی اور تاریخی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ عُکاظ کے بازار میں کب تشریف لے گئے تھے۔

البتہ اِس سورہ کی آیات ۸ ۔ ۱۰ پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ نبوّت کے ابتدائی دوَر کا واقعہ ہی ہو سکتا ہے۔ ان آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے جن عالمِ بالا کی خبریں معلوم کرنے کے لیے آسمان میں سُن گُن لینے کا کوئی نہ کوئی موقع پا لیتے تھے، مگر اس کے بعد یکایک انہوں نے دیکھا کہ ہر طرف فرشتوں کے سخت پہرے لگ گئے ہیں اور شہابوں کی بارش ہو رہی ہے جس کی وجہ سے کہیں اُن کو ایسی جگہ نہیں ملتی جہاں ٹھیر کر وہ کوئی بِھنک پا سکیں۔ اِس سے اُن کو یہ معلوم کرنے کی فکر لاحق ہوئی کہ زمین میں ایسا کیا واقعہ پیش آیا ہے یا آنے والا ہے جس کے لیے یہ سخت انتظامات کیے گئے ہیں۔ غالباً اُسی وقت سے جنوں کے بہت سے گروہ اِس تلاش میں

پھرتے رہے ہوں گے اور ان میں سے ایک گروہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے قرآن سُن کر یہ رائے قائم کی ہو گی کہ یہی وہ چیز ہے جس کی خاطر جنوں پر عالمِ بالا کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے ہیں۔

جن کی حقیقت اس سورے کا مطالعہ شروع کرنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ جنوں کی حقیقت کیا ہے تاکہ ذہن کسی اُلجھن کے شکار نہ ہوں۔ موجودہ زمانے کے بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ جن کسی حقیقی چیز کا نام نہیں ہے بلکہ یہ بھی پرانے زمانے کے اوہام و خرافات میں سے ایک بے بنیاد خیال ہے۔ یہ رائے انہوں نے کچھ اس بنا پر قائم نہیں کی ہے کہ کائنات کی ساری حقیقتوں کو وہ جان چکے ہیں اور انہیں یہ معلوم ہو گیا ہے کہ جن کہیں موجود نہیں ہیں۔ ایسے علم کا دعویٰ وہ خود بھی نہیں کر سکتے۔ مگر انہوں نے بلا دلیل یہ فرض کر لیا ہے کہ کائنات میں بس وہی کچھ موجود ہے جو ان کو محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ انسان کے محسوسات کا دائرہ اِس عظیم کائنات کی وسعت کے مقابلہ میں وہ نسبت بھی نہیں رکھتا جو سمندر کے مقابلے میں قطرے کی نسبت ہے۔ یہاں جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ محسوس نہیں ہے وہ موجود نہیں ہے، اور جو موجود ہے اسے لازماً محسوس ہونا چاہیے، وہ دراصل خود اپنے ذہن کی تنگی کا ثبوت دیتا ہے۔ یہ طرزِ فکر اختیار کر لیا جائے تو ایک جن ہی کیا، انسان کسی ایسی حقیقت کو بھی نہیں مان سکتا جو براہِ راست اس کے تجربے اور مشاہدے میں نہ آتی ہو اور اُس کے لیے خدا تک کا وجود قابلِ تسلیم نہیں ہے کجا کہ وہ کسی اور غیر محسوس حقیقت کو تسلیم کرے۔

مسلمانوں میں سے جو لوگ اِس طرزِ فکر سے متاثر ہیں، مگر قرآن کا انکار بھی نہیں کر سکتے انہوں نے جن اور ابلیس اور شیطان کے متعلق قرآن کے صاف صاف بیانات کو طرح طرح کی تاویلات کا تختۂ مشق بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد کوئی ایسی پوشیدہ مخلوق نہیں ہے جو اپنا ایک مستقل وجود رکھتی ہو، بلکہ کہیں تو اس سے مراد انسان کی اپنی

بھیمی قوتیں ہیں جنہیں شیطان کہا گیا ہے، اور کہیں اس سے مراد وحشی اور جنگلی اور پہاڑی قومیں ہیں، اور کہیں اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو چھپ چھپ کر قرآن سنا کرتے تھے۔ لیکن قرآن مجید کے ارشادات اس معاملہ میں اس قدر صاف اور صریح ہیں کہ ان تاویلات کے لیے ان کے اندر کوئی ادنیٰ سی گنجائش بھی نہیں ہے۔

قرآن میں ایک جگہ نہیں، بکثرت مقامات پر جن اور انسان کا ذکر اس حیثیت سے کیا گیا ہے کہ یہ دو الگ قسم کی مخلوقات ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو سورۂ اعراف، آیت ۳۸۔ ہود، ۱۱۹۔ حٰم السجدہ، آیات ۲۵ و ۲۹۔ الاحقاف، ۱۸۔ الذاریات، ۵۶۔ الناس، ۶۔ اور سورۂ رحمان تو پوری کی پوری اس پر ایسی صریح شہادت دیتی ہے کہ جنوں کو انسانوں کی کوئی قسم سمجھنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑتی۔

سورۂ اعراف، آیت ۱۲، سورۂ حجر، آیات ۲۶۔۲۷، اور سورۂ رحمان، آیات ۱۴۔۱۵ میں صاف صاف بتایا گیا ہے کہ انسان کا مادۂ تخلیق مٹی ہے اور جنوں کا مادۂ تخلیق آگ۔

سورۂ حجر آیت ۲۷ میں صراحت کی گئی ہے کہ جن انسان سے پہلے پیدا کیے گئے تھے۔ اسی بات پر قصۂ آدم و ابلیس شہادت دیتا ہے جو قرآن میں سات مقامات پر بیان ہوا ہے اور ہر جگہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی تخلیق کے وقت ابلیس موجود تھا۔ نیز سورۂ کہف آیت ۵۰ میں بتایا گیا ہے کہ ابلیس جنوں میں سے ہے۔

سورۂ اعراف آیت ۲۷ میں بالفاظِ صریح یہ کہا گیا ہے کہ جن انسانوں کو دیکھتے ہیں مگر انسان ان کو نہیں دیکھتے۔

سورۂ حجر آیات ۱۶۔۱۸، سورۂ صافات، آیات ۶۔۱۰، اور سورۂ ملک آیت ۵ میں بتایا گیا ہے کہ جن اگرچہ عالمِ بالا کی طرف پرواز کر سکتے ہیں، مگر ایک حد سے آگے نہیں جا سکتے۔ اس سے اوپر جانے کی کوشش کریں اور ملاءِ اعلیٰ کی باتیں سننا چاہیں تو انہیں روک

دیا جاتا ہے۔ چوری چھپے سن گن لیں تو شہاب ثاقب ان کو مار بھگاتے ہیں۔ اس سے مشرکین عرب کے اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ جن غیب کا علم رکھتے ہیں یا خدائی کے اسرار تک انہیں کوئی رسائی حاصل ہے۔ اسی غلط خیال کی تردید سورۂ سبا آیت ۱۴ میں بھی کی گئی ہے۔

سورۂ بقرہ، آیات ۳۰ - ۳۴ اور سورۂ کہف آیت ۵۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی خلافت اللہ تعالیٰ نے انسان کو دی ہے اور انسان جنوں سے افضل مخلوق ہیں۔ اگرچہ بعض غیر معمولی طاقتیں جنوں کو بھی بخشی گئی ہیں جن کی ایک مثال ہمیں سورۂ نمل آیت ۳۹ میں ملتی ہے، لیکن اسی طرح بعض طاقتیں حیوانات کو بھی انسان سے زیادہ ملی ہیں، اور وہ اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہیں کہ جانوروں کو انسان پر فضیلت حاصل ہے۔

قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ جن انسان کی طرح ایک با اختیار مخلوق ہے اور اُس کو طاعت و معصیت اور کفر و ایمان کا ویسا ہی اختیار دیا گیا ہے جیسا انسان کو دیا گیا ہے۔ اس پر ابلیس کا قصہ اور سورۂ احقاف اور سورۂ جن میں بعض جنوں کے ایمان لانے کا واقعہ صریح دلالت کرتا ہے۔

قرآن میں بیسیوں مقامات پر یہ حقیقت بھی بیان کی گئی ہے کہ ابلیس نے تخلیق آدم کے وقت ہی یہ عزم کر لیا تھا کہ وہ نوع انسانی کو گمراہ کرنے کی کوشش کرے گا اور اُسی وقت سے شیاطین جن انسان کو گمراہ کرنے کے درپے ہیں، مگر وہ اُس پر مسلط ہو کر زبردستی اس سے کوئی کام کرا لینے کی طاقت نہیں رکھتے، بلکہ وہ اُس کے دل میں وسوسے ڈالتے ہیں، اُس کو بہکاتے ہیں اور بدی و گمراہی کو اس کے سامنے خوشنما بنا کر پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر حسب ذیل آیات ملاحظہ ہوں: النساء، ۱۱۷ تا ۱۲۰۔ الاعراف، ۱۱ تا ۱۷۔ ابراہیم، ۲۲۔ الحجر، ۳۰ تا ۴۲۔ النحل، ۹۸ تا ۱۰۰۔ بنی اسرائیل، ۶۱ تا ۶۵۔

قرآن میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مشرکین عرب زمانۂ جاہلیت میں جنوں کو خدا کا شریک ٹھیراتے تھے، اُن کی عبادت کرتے تھے، اور اُن کا نسب خدا سے ملاتے تھے۔ ملاحظہ ہو

الانعام، آیت ۱۰۰ ۔ سبا، آیات ۴۰ ۔ ۴۱ ۔ الصّٰفّٰت، ۱۵۸ ۔

اِن تفصیلات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جن اپنا ایک مستقل خارجی وجود رکھتے ہیں اور وہ انسان سے الگ ایک دوسری ہی نوع کی پوشیدہ مخلوق ہیں ۔ اُن کی پُراسرار صفات کی وجہ سے جاہل لوگوں نے ان کی ہستی اور ان کی طاقتوں کے متعلق بڑے مبالغہ آمیز تصورات قائم کر رکھے ہیں، حتیٰ کہ ان کی پرستش تک کر ڈالی گئی ہے، مگر قرآن نے ان کی اصل حقیقت پوری طرح کھول کر بیان کر دی ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں ۔

موضوع اور مباحث: اس سورہ میں پہلی آیت سے لے کر آیت ۱۵ تک یہ بتایا گیا ہے کہ جنوں کے ایک گروہ نے قرآن مجید سُن کر اُس کا کیا اثر لیا اور پھر واپس جا کر اپنی قوم کے دوسرے جنوں سے کیا کیا باتیں کہیں ۔ اِس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے اُن کی ساری گفتگو نقل نہیں کی ہے بلکہ صرف وہ خاص خاص باتیں نقل فرمائی ہیں جو قابلِ ذکر تھیں ۔ اسی لیے طرزِ بیان ایک مسلسل گفتگو کا سا نہیں ہے، بلکہ اُن کے مختلف فقروں کو اِس طرح نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے یہ کہا اور یہ کہا ۔ جنوں کی زبان سے نکلے ہوئے ان فقروں کو اگر آدمی بغور پڑھے تو بآسانی یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اُن کے ایمان لانے کے اِس واقعے اور اپنی قوم کے ساتھ ان کی اس گفتگو کا ذکر قرآن میں کس غرض کے لیے کیا گیا ہے ۔ ہم نے اپنے حواشی میں ان کے اقوال کی جو تشریحات کی ہیں وہ اِس کا مقصد سمجھنے میں مزید مددگار ہوں گی ۔

اس کے بعد آیت ۱۶ سے ۱۸ تک لوگوں کو فہمائش کی گئی ہے کہ وہ شرک سے باز آ جائیں اور راہِ راست پر ثابت قدمی کے ساتھ چلیں تو ان پر نعمتوں کی بارش ہو گی ورنہ اللہ کی بھیجی ہوئی نصیحت سے منہ موڑنے کا انجام یہ ہو گا کہ وہ سخت عذاب سے دوچار ہوں گے ۔ پھر آیت ۱۹ سے ۲۳ تک کفارِ مکہ کو اس بات پر ملامت کی گئی ہے کہ

جب اللہ کا رسول دعوت الی اللہ کی آواز بلند کرتا ہے تو وہ اس پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، حالانکہ رسول کا کام صرف اللہ کے پیغامات پہنچا دینا ہے، وہ اس بات کا مدعی نہیں ہے کہ لوگوں کو نفع یا نقصان پہنچا دینا اس کے اختیار میں ہے۔ پھر آیات ۲۴-۲۵ میں کفار کو متنبہ کیا گیا ہے کہ آج وہ رسول کو بے یار و مددگار دیکھ کر اسے دبا لینے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن ایک وقت آئے گا جب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اصل میں بے یار و مددگار کون ہے۔ وہ وقت دور ہے یا قریب، رسول کو اس کا علم نہیں ہے، مگر بہر حال اسے آنا ضرور ہے۔ آخر میں لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ رسول کو صرف وہ علم حاصل ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ اسے دینا چاہتا ہے۔ یہ علم اُن امور سے متعلق ہوتا ہے جو فرائض رسالت کی انجام دہی کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ اور یہ علم ایسے محفوظ طریقہ سے دیا جاتا ہے جس میں کسی بیرونی مداخلت کا امکان نہیں ہوتا۔

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

اے نبی، کہو، میری طرف وحی بھیجی گئی ہے کہ جنوں کے ایک گروہ نے غور سے سُنا[1] پھر جا کر اپنی قوم کے لوگوں سے کہا:

"ہم نے ایک بڑا ہی عجیب قرآن سنا ہے[2] جو راہِ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے اس لیے ہم

---

[1] اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس وقت جنوں کو قرآن سنتے ہوئے دیکھا نہیں تھا بلکہ بعد میں وحی کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس واقعہ کی خبر دی۔ حضرت عبداللہ بن عباس بھی اِس قصے کو بیان کرتے ہوئے صراحت فرماتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنوں کے سامنے قرآن نہیں پڑھا تھا، نہ آپ نے ان کو دیکھا تھا" (مسلم۔ ترمذی۔ مسند احمد۔ ابنِ جریر)۔

[2] اصل الفاظ ہیں قُرْاٰنًا عَجَبًا۔ قرآن کے معنی ہیں "پڑھی جانے والی چیز" اور یہ لفظ غالباً جنوں نے اسی معنی میں استعمال کیا ہو گا کیونکہ وہ پہلی مرتبہ اس کلام سے متعارف ہوئے تھے اور شاید اُس وقت اُن کو

اُس پر ایمان لے آئے ہیں اور اب ہم ہرگز اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے"؛ ۳؎
اور یہ کہ "ہمارے رب کی شان بہت اعلیٰ و ارفع ہے، اُس نے کسی کو بیوی یا بیٹا نہیں بنایا ہے"
اور یہ کہ "ہمارے نادان لوگ ۵؎ اللہ کے بارے میں بہت خلافِ حق باتیں کہتے رہے ہیں"؛
اور یہ کہ "ہم نے سمجھا تھا کہ انسان اور جن کبھی خدا کے بارے میں جھوٹ نہیں بول سکتے ۶؎

یہ معلوم نہ تھا کہ جو چیز وہ سُن رہے ہیں اس کا نام قرآن ہی ہے۔ عَجَب مبالغہ کا صیغہ ہے اور یہ لفظ عربی زبان میں بہت زیادہ حیرت انگیز چیز کے لیے بولا جاتا ہے۔ پس جنوں کے قول کا مطلب یہ ہے کہ ہم ایک ایسا کلام سُن کر آئے ہیں جو اپنی زبان اور اپنے مضامین کے اعتبار سے بے نظیر ہے۔

اِس سے یہ بھی معلوم ہوُا کہ جن نہ صرف یہ کہ انسانوں کی باتیں سنتے ہیں بلکہ ان کی زبان بخوبی سمجھتے بھی ہیں۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام جن تمام انسانی زبانیں جانتے ہوں۔ ممکن ہے کہ اُن میں سے جو گروہ زمین کے جس علاقے میں رہتے ہوں اسی علاقے کے لوگوں کی زبان سے وہ واقف ہوں۔ لیکن قرآن کے اِس بیان سے بہر حال یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جن جنہوں نے اُس وقت قرآن سنا تھا وہ عربی زبان اتنی اچھی جانتے تھے کہ انہوں نے اِس کلام کی بے مثل بلاغت کو بھی محسوس کیا اور اس کے بلند پایہ مضامین کو بھی خوب سمجھ لیا۔

۳؎ اِس سے کئی باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ جن اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کے رب ہونے کے منکر نہیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان میں بھی مشرکین پائے جاتے ہیں جو مشرک انسانوں کی طرح اللہ کے ساتھ دوسروں کو خدائی میں شریک ٹھیراتے ہیں، چنانچہ جنوں کی یہ قوم جس کے افراد قرآن سُن کر گئے تھے مُشرک ہی تھی۔ تیسرے یہ کہ نبوت اور کتبِ آسمانی کے نزول کا سلسلہ جنوں کے ہاں جاری نہیں ہوُا ہے، بلکہ ان میں سے جو جن بھی ایمان لاتے ہیں وہ انسانوں میں آنے والے انبیاء اور ان کی لائی ہوئی کتابوں پر ہی ایمان لاتے ہیں۔ یہی بات سُورۂ احقاف آیات ۲۹-۳۱ سے بھی معلوم ہوتی ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ وہ جن جنہوں نے اُس وقت قرآن سُنا تھا، حضرت مُوسیٰ کے پیروؤں میں سے تھے اور انہوں نے قرآن سُننے کے بعد اپنی قوم کو دعوت دی تھی کہ اب جو کلام خدا کی طرف سے پچھلی کتبِ آسمانی کی تصدیق کرتا ہوُا آیا ہے اُس پر ایمان

اور یہ کہ "انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ مانگا کرتے تھے، اس طرح انہوں نے جنوں کا غرور اور زیادہ بڑھا دیا"۔

لائق۔ سورۂ رحمان بھی اسی بات پر دلالت کرتی ہے، کیونکہ اس کا پورا مضمون ہی یہ ظاہر کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مخاطب انسان اور جن دونوں ہیں۔

؎ اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ جن یا تو عیسائی جنوں میں سے تھے، یا ان کا کوئی اور مذہب تھا جس میں اللہ تعالیٰ کو بیوی بچوں والا سمجھا جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں قرآن پاک کا کوئی ایسا حصہ پڑھ رہے تھے جسے سُن کر ان کو اپنے عقیدے کی غلطی معلوم ہوگئی اور انہوں نے یہ جان لیا کہ اللہ تعالیٰ کی بلند و برتر ذات کی طرف بیوی بچوں کو منسوب کرنا سخت جہالت اور گستاخی ہے۔

؎ اصل میں لفظ سَفِیْهُنَا استعمال کیا گیا ہے جو ایک فرد کے لیے بھی بولا جا سکتا ہے اور ایک گروہ کے لیے بھی۔ اگر اسے ایک نادان فرد کے معنی میں لیا جائے تو مُراد ابلیس ہوگا۔ اور اگر ایک گروہ کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جنوں میں بہت سے احمق اور بے عقل لوگ ایسی باتیں کہتے تھے۔

؎ یعنی اُن کی غلط باتوں سے ہمارے گمراہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ ہم کبھی یہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ انسان یا جن اللہ کے بارے میں بھی جھوٹ گھڑنے کی جرأت کر سکتے ہیں، لیکن اب یہ قرآن سُن کر ہمیں معلوم ہوگیا کہ فی الواقع وہ جھوٹے تھے۔

؎ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جاہلیت کے زمانے میں جب عرب کسی سُنسان وادی میں رات گزارتے تھے تو پکار کر کہتے "ہم اس وادی کے مالک (یعنی جن) کی پناہ مانگتے ہیں"۔ عہدِ جاہلیت کی دوسری روایات میں بھی بکثرت اس بات کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً اگر کسی جگہ پانی اور چارہ ختم ہو جاتا تو خانہ بدوش بدو اپنا ایک آدمی کوئی دوسری جگہ تلاش کرنے کے لیے بھیجتے جہاں پانی اور چارہ مل سکتا ہو، پھر اُس کی نشان دہی پر جب یہ لوگ نئی جگہ پہنچتے تو وہاں اُترنے سے پہلے پکار پکار کر کہتے "کہ ہم اس وادی کے رب کی پناہ مانگتے ہیں تاکہ یہاں ہم ہر آفت سے محفوظ رہیں"۔ ان لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ ہر غیر آباد جگہ کسی نہ کسی جن کے

اور یہ کہ " انسانوں نے بھی وہی گمان کیا جیسا تمہارا گمان تھا کہ اللہ کسی کو رسول بنا کر نہ بھیجے گا۔"[ش]

اور یہ کہ " ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو دیکھا کہ وہ پہرداروں سے پٹا پڑا ہے اور شہابوں کی بارش ہو رہی ہے۔" اور یہ کہ " پہلے ہم سن گن لینے کے لیے آسمان میں بیٹھنے کی جگہ پا لیتے تھے، مگر اب جو چوری چھپے سننے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنے لیے گھات میں ایک شہابِ ثاقب لگا ہوا پاتا ہے[۹]۔"

اور یہ کہ " ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آیا زمین والوں کے ساتھ کوئی برا معاملہ کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کا رب انہیں راہِ راست دکھانا چاہتا ہے[۱۰]۔"

قبضے میں ہے اور اس کی پناہ مانگے بغیر وہاں کوئی ٹھیر جائے تو وہ جن یا تو خود ستاتا ہے یا دوسرے جنوں کو ستانے دیتا ہے۔ اسی بات کی طرف یہ ایمان لانے والے جن اشارہ کر رہے ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ جب زمین کے خلیفہ انسان نے الٹا ہم سے ڈرنا شروع کر دیا اور خدا کو چھوڑ کر وہ ہم سے پناہ مانگنے لگا تو ہماری قوم کے لوگوں کا دماغ اور زیادہ خراب ہو گیا، ان کا کبر و غرور اور کفر و ظلم اور زیادہ بڑھ گیا، اور وہ گمراہی میں زیادہ جری ہو گئے۔

ش اصل الفاظ ہیں اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا۔ اس فقرے کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو ہم نے ترجمہ میں اختیار کیے ہیں۔ دوسرے یہ کہ " اللہ کسی کو مرنے کے بعد دوبارہ نہ اٹھائے گا۔" چونکہ الفاظ جامع ہیں اس لیے ان کا یہ مطلب لیا جا سکتا ہے کہ انسانوں کی طرح جنوں میں بھی رسالت اور آخرت دونوں کا انکار پایا جاتا تھا۔ لیکن آگے کے مضمون کی مناسبت سے پہلا مفہوم ہی زیادہ قابلِ ترجیح ہے، کیونکہ اس میں یہ ایمان لانے والے جن اپنی قوم کے لوگوں کو بتاتے ہیں کہ تمہارا یہ خیال غلط نکلا کہ اللہ کسی رسول کو مبعوث کرنے والا نہیں ہے، آسمانوں کے دروازے ہم پر اسی وجہ سے بند کیے گئے ہیں کہ اللہ نے ایک رسول بھیج دیا ہے۔

۹ یہ ہے وہ وجہ جس کی بنا پر یہ جن اس تلاش میں نکلے تھے کہ آخر زمین پر ایسا کیا معاملہ پیش آیا ہے یا آنے والا ہے جس کی خبروں کو محفوظ رکھنے کے لیے اس قدر سخت انتظامات کیے گئے ہیں کہ ہم عالمِ بالا میں سن گن لینے کا کوئی موقع نہیں پاتے اور جدھر بھی ہم جاتے ہیں ہمیں مار بھگایا جاتا ہے۔

اور یہ کہ "ہم میں سے کچھ لوگ صالح ہیں اور کچھ اس سے فروتر ہیں، ہم مختلف طریقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔[11]

اور یہ کہ "ہم سمجھتے تھے کہ نہ زمین میں ہم اللہ کو عاجز کر سکتے ہیں اور نہ بھاگ کر اُسے ہرا سکتے ہیں"[12]

[10] اس سے معلوم ہؤا کہ عالمِ بالا میں اس قسم کے غیر معمولی انتظامات دو ہی حالتوں میں کیے جاتے تھے۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ زمین پر کوئی عذاب نازل کرنے کا فیصلہ کیا ہو اور منشائے الٰہی یہ ہو کہ اس کے نزول سے پہلے جن اس کی بھنک پا کر اپنے دوست انسانوں کو خبردار نہ کر دیں۔ دوسرے یہ کہ اللہ نے زمین میں کسی رسول کو مبعوث فرمایا ہو اور تحفظ کے اِن انتظامات سے مقصود یہ ہو کہ رسول کی طرف جو پیغامات بھیجے جا رہے ہیں اُن میں نہ تو شیاطین کسی قسم کی خلل اندازی کر سکیں اور نہ قبل از وقت یہ معلوم کر سکیں کہ پیغمبر کو کیا ہدایات دی جا رہی ہیں۔ پس جنوں کے اِس قول کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم نے آسمان میں یہ چوکی پہرے دیکھے اور شہابوں کی اس بارش کا مشاہدہ کیا تو ہمیں یہ معلوم کرنے کی فکر لاحق ہوئی کہ ان دونوں صورتوں میں سے کونسی صورت درپیش ہے۔ آیا اللہ تعالیٰ نے زمین میں کسی قوم پر یکایک عذاب نازل کر دیا ہے؟ یا کہیں کوئی رسول مبعوث ہؤا ہے؟ اسی تلاش میں ہم نکلے تھے کہ ہم نے وہ حیرت انگیز کلام سنا جو راہِ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور ہمیں معلوم ہو گیا کہ اللہ نے عذاب نازل نہیں کیا ہے بلکہ خلق کو راہِ راست دکھانے کے لیے ایک رسول مبعوث فرما دیا ہے (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، الحجر، حواشی ۸ تا ۱۲۔ جلد چہارم، الصّٰفّٰت، حاشیہ ۷۔ جلد پنجم، المُلک، حاشیہ ۱۱)۔

[11] یعنی اخلاقی حیثیت سے بھی ہم میں اچھے اور بُرے دونوں طرح کے جن پائے جاتے ہیں، اور اعتقادات میں بھی ہمارا کوئی ایک مذہب نہیں ہے بلکہ ہم مختلف گروہوں میں منقسم ہیں۔ یہ بات کہہ کر یہ ایمان لانے والے جن اپنی قوم کے جنوں کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ ہم راہِ راست معلوم کرنے کے یقیناً محتاج ہیں، اِس سے ہم بے نیاز نہیں ہو سکتے۔

[12] مطلب یہ ہے کہ ہمارے اِسی خیال نے ہمیں نجات کی راہ دکھا دی۔ ہم چونکہ اللہ سے بے خوف نہ تھے اور ہمیں یقین تھا کہ اگر ہم نے اس کی نافرمانی کی تو اس کی گرفت سے کسی طرح بچ نہ سکیں گے، اس لیے جب

اور یہ کہ "ہم نے جب ہدایت کی تعلیم سنی تو ہم اس پر ایمان لے آئے۔ اب جو کوئی بھی اپنے رب پر ایمان لے آئے گا اسے کسی حق تلفی یا ظلم کا خوف نہ ہوگا[۱۳]۔"

اور یہ کہ "ہم میں سے کچھ مسلم (اللہ کے اطاعت گزار) ہیں اور کچھ حق سے منحرف۔ تو جنہوں نے اسلام (اطاعت کا راستہ) اختیار کر لیا انہوں نے نجات کی راہ ڈھونڈ لی، اور جو حق سے منحرف ہیں وہ جہنّم کا ایندھن بننے والے ہیں[۱۴]۔"

اور[۱۵] (اے نبی کہو، مجھ پر یہ وحی بھی کی گئی ہے کہ) لوگ اگر راہِ راست پر ثابت قدمی سے چلتے تو ہم انہیں خوب سیراب کرتے[۱۶] تاکہ اس نعمت سے ان کی آزمائش کریں[۱۷]۔ اور جو اپنے رب کے ذکر سے منہ موڑے گا[۱۸] اُس کا رب اسے سخت عذاب میں مبتلا کر دے گا۔ اور یہ کہ مسجدیں اللہ کے لیے ہیں؛

وہ کلام ہم نے سُنا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے راہِ راست بتانے آیا تھا تو ہم یہ جرأت نہ کر سکے کہ حق معلوم ہو جانے کے بعد بھی انہی عقائد پر جمے رہتے جو ہمارے نادان لوگوں نے ہم میں پھیلا رکھے ہیں۔

[۱۳] حق تلفی سے مراد یہ ہے کہ اپنی نیکی پر وہ جتنے اجر کا مستحق ہو اُس سے کم دیا جائے۔ اور ظلم یہ ہے کہ اُسے نیکی کا کوئی اجر نہ دیا جائے اور جو قصور اس سے سرزد ہوں ان کی زیادہ سزا دے ڈالی جائے۔ کسی ایمان لانے والے کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں اِس قسم کی کسی بے انصافی کا خوف نہیں ہے۔

[۱۴] سوال کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کی رُو سے جن تو خود آتشیں مخلوق ہیں۔ پھر جہنّم کی آگ سے ان کو کیا تکلیف ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کی رُو سے تو آدمی بھی مٹی سے بنا ہے، پھر اگر اسے مٹی کا ڈھیلا کھینچ مارا جائے تو اس کو چوٹ کیوں لگتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا پورا جسم اگرچہ زمین کے مادّوں سے بنا ہے، مگر جب اُن سے گوشت پوست کا زندہ انسان وجود میں آجاتا ہے تو وہ ان مادّوں سے بالکل مختلف چیز بن جاتا ہے اور انہی مادّوں سے بنی ہوئی دوسری چیزیں اس کے لیے اذیّت کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جن بھی اگرچہ اپنی ساخت کے اعتبار سے آتشیں مخلوق ہیں، لیکن آگ سے جب ایک زندہ اور صاحبِ احساس مخلوق وجود میں آجاتی ہے تو وہی آگ اس کے لیے تکلیف کی موجب بن جاتی ہے (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد پنجم، الرحمٰن، حاشیہ ۱۵)۔

لہٰذا اُن میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو۔[۱۹] اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ[۲۰] اُس کو پکارنے کے لیے کھڑا ہوا تو لوگ اُس پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہوگئے۔[۲۱] اے نبیؐ، کہو کہ میں تو اپنے رب کو پکارتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔[۲۲]

۱۵؎ اوپر جنوں کی بات ختم ہوگئی۔ اب یہاں سے اللہ تعالیٰ کے اپنے ارشادات شروع ہوتے ہیں

۱۶؎ یہ وہی بات ہے جو سُورۂ نوح میں فرمائی گئی ہے کہ اللہ سے معافی مانگو تو وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ نوح، حاشیہ ۱۲)۔ پانی کی کثرت کو نعمتوں کی کثرت کے لیے بطورِ کنایہ استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ پانی ہی پر آبادی کا انحصار ہے۔ پانی نہ ہو تو سرے سے کوئی بستی بس ہی نہیں سکتی، نہ انسان کی بنیادی ضروریات فراہم ہوسکتی ہیں، اور نہ انسان کی صنعتیں چل سکتی ہیں۔

۱۷؎ یعنی یہ دیکھیں کہ وہ نعمت پا کر بھی شکر گزار رہتے ہیں یا نہیں، اور ہماری دی ہوئی نعمت کا صحیح استعمال کرتے ہیں یا غلط۔

۱۸؎ ذکر سے مُنہ موڑنے کا مطلب یہ بھی ہے کہ آدمی اللہ کی بھیجی ہوئی نصیحت کو قبول نہ کرے، اور یہ بھی کہ وہ اللہ کا ذکر سننا ہی گوارا نہ کرے، اور یہ بھی کہ وہ اللہ کی عبادت سے رُوگردانی کرے۔

۱۹؎ مفسّرین نے بالعموم "مساجد" کو عبادت گاہوں کے معنی میں لیا ہے اور اس معنی کے لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ عبادت گاہوں میں اللہ کے ساتھ کسی اور کی عبادت نہ کی جائے۔ حضرت حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ زمین پوری کی پوری عبادت گاہ ہے اور آیت کا منشا یہ ہے کہ خدا کی زمین پر کہیں بھی شرک نہ کیا جائے۔ ان کا استدلال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہے کہ جعلت لی الارض مسجداً وطھوراً۔ "میرے لیے پُوری زمین عبادت کی جگہ اور طہارت حاصل کرنے کا ذریعہ بنائی گئی ہے"۔ حضرت سعید بن جُبیرؓ نے مساجد سے مراد وہ اعضاء لیے ہیں جن پر آدمی سجدہ کرتا ہے، یعنی ہاتھ، گھٹنے، قدم اور پیشانی۔ اِس تفسیر کی رُو سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ اعضاء اللہ کے بنائے ہوئے ہیں۔ ان پر اللہ کے سوا کسی اور کے لیے سجدہ نہ کیا جائے۔

۲۰؎ اللہ کے بندے سے مراد یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

۲۱؎ یعنی خدا کو پکارنا تو کوئی قابلِ اعتراض کام نہیں ہے جس پر لوگوں کو اس قدر غصہ آئے۔ البتہ بری بات اگر ہے تو یہ کہ کوئی شخص خدا کے ساتھ کسی اور کو خدائی میں شریک ٹھیرائے، اور یہ کام میں نہیں کرتا بلکہ

کہو، مَیں تم لوگوں کے لیے نہ کسی نقصان کا اختیار رکھتا ہوں نہ کسی بھلائی کا۔ کہو، مجھے اللہ کی گرفت سے کوئی بچا نہیں سکتا اور نہ میں اُس کے دامن کے سوا کوئی جائے پناہ پا سکتا ہوں۔ میرا کام اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ کی بات اور اس کے پیغامات پہنچا دوں[۲۲]۔ اب جو بھی اللہ اور اس کے رسول کی بات نہ مانے گا اس کے لیے جہنم کی آگ ہے اور ایسے لوگ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔[۲۳] (یہ لوگ اپنی اِس روش سے باز نہ آئیں گے) یہاں تک کہ جب اُس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس کے مددگار کمزور ہیں اور کس کا جتھا تعداد میں کم ہے[۲۴]۔

وہ لوگ کرتے ہیں جو خدا کا نام سُن کر مجھ پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔

۲۲؎ یعنی میرا یہ دعویٰ ہرگز نہیں ہے کہ خدا کی خدائی میں میرا کوئی دخل ہے، یا لوگوں کی قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کا کوئی اختیار مجھے حاصل ہے۔ مَیں تو صرف ایک رسول ہوں اور جو خدمت میرے سپرد کی گئی ہے وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیغامات تمہیں پہنچا دوں۔ باقی رہے خدائی کے اختیارات تو وہ سارے کے سارے اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ کسی دوسرے کو نفع یا نقصان پہنچانا تو درکنار، مجھے تو خود اپنے نفع و نقصان کا اختیار بھی حاصل نہیں۔ اللہ کی نافرمانی کروں تو اس کی پکڑ سے بچ کر کہیں پناہ نہیں لے سکتا، اور اللہ کے دامن کے سوا کوئی ملجا و ماویٰ میرے لیے نہیں ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، الشوریٰ، حاشیہ ۷)۔

۲۳؎ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر گناہ اور معصیت کی سزا ابدی جہنم ہے، بلکہ جس سلسلہ کلام میں یہ بات فرمائی گئی ہے اس کے لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے توحید کی جو دعوت دی گئی ہے اس کو جو شخص نہ مانے اور شرک سے باز نہ آئے اس کے لیے ابدی جہنم کی سزا ہے۔

۲۴؎ اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ اُس زمانے میں قریش کے جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی دعوت الی اللہ کو سنتے ہی آپ پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ وہ اس زعم میں مبتلا تھے کہ اُن کا جتھا بڑا زبردست ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چند مٹھی بھر آدمی ہیں اس لیے وہ بآسانی

کہو، مَیں نہیں جانتا کہ جس چیز کا وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ قریب ہے یا میرا رب اس کے لیے کوئی لمبی مدت مقرر فرماتا ہے۔[۲۵] وہ عالم الغیب ہے، اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا،[۲۶] سوائے اُس رسول کے جسے اُس نے (غیب کا کوئی علم دینے کے لیے) پسند کر لیا ہو،[۲۷] تو اُس کے آگے اور پیچھے وہ محافظ لگا دیتا ہے[۲۸] تاکہ وہ جان لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیے،[۲۹] اور وہ اُن کے پورے

آپ کو دبا لیں گے۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ آج یہ لوگ رسول کو بے یار و مددگار اور اپنے آپ کو کثیر التعداد دیکھ کر حق کی آواز کو دبانے کے لیے بڑے دلیر ہو رہے ہیں، مگر جب وہ بُرا وقت آجائے گا جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے تو اِن کو پتہ چل جائے گا کہ بے یار و مددگار حقیقت میں کون ہے۔

۲۵؎ اندازِ بیان سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک سوال کا جواب ہے جو سوال نقل کیے بغیر دیا گیا ہے۔ غالباً اوپر کی بات سُن کر مخالفین نے طنز اور مذاق کے طور پر سوال کیا ہو گا کہ وہ وقت جس کا ڈراوا آپ دے رہے ہیں آخر کب آئے گا؟ اس کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ ان لوگوں سے کہو، اُس وقت کا آنا تو یقینی ہے مگر اس کے آنے کی تاریخ مجھے نہیں بتائی گئی۔ یہ بات اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ آیا وہ جلدی آنے والا ہے یا اس کے لیے ایک طویل مدت مقرر کی گئی ہے۔

۲۶؎ یعنی غیب کا پُورا علم اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے، اور یہ مکمل علمِ غیب وہ کسی کو بھی نہیں دیتا۔

۲۷؎ یعنی رسول بجائے خود عالم الغیب نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ جب اس کو رسالت کا فریضہ انجام دینے کے لیے منتخب فرماتا ہے تو غیب کے حقائق میں سے جن چیزوں کا علم وہ چاہتا ہے اسے عطا فرما دیتا ہے۔

۲۸؎ محافظوں سے مراد فرشتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعہ سے غیب کے حقائق کا علم رسول کے پاس بھیجتا ہے تو اس کی نگہبانی کرنے کے لیے ہر طرف فرشتے مقرر کر دیتا ہے تاکہ وہ علم نہایت محفوظ طریقے سے رسول تک پہنچ جائے اور اس میں کسی قسم کی آمیزش نہ ہونے پائے۔ یہ وہی بات ہے جو اوپر آیات ۸-۹ میں بیان ہوئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد جنوں نے اپنے لیے عالمِ بالا تک رسائی کے تمام دروازے بند پائے اور انہوں نے دیکھا کہ سخت چوکی پہرے

ماحول کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور ایک ایک چیز کو اس نے گن رکھا ہے ع ع

لگ گئے ہیں جن کے باعث کہیں ذرا سی سُن گُن لینے کا موقع بھی ان کو نہیں ملتا۔

۲۹ اس کے تین معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ رسول یہ جان لے کہ فرشتوں نے اس کو اللہ تعالیٰ کے پیغامات ٹھیک ٹھیک پہنچا دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ یہ جان لے کہ فرشتوں نے اپنے رب کے پیغامات اس کے رسول تک صحیح صحیح پہنچا دیئے ہیں۔ تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ یہ جان لے کہ رسولوں نے اس کے بندوں تک اپنے رب کے پیغامات ٹھیک ٹھیک پہنچا دیئے۔ آیت کے الفاظ ان تینوں معنوں پر حاوی ہیں اور بعید نہیں کہ تینوں ہی مراد ہوں۔ اس کے علاوہ یہ آیت دو مزید باتوں پر بھی دلالت کرتی ہے۔ پہلی بات یہ کہ رسول کو وہ علمِ غیب عطا کیا جاتا ہے جو فریضۂ رسالت کی انجام دہی کے لیے اس کو دینا ضروری ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ جو فرشتے نگہبانی کے لیے مقرر کیے جاتے ہیں وہ صرف اسی بات کی نگہبانی نہیں کرتے کہ رسول تک وحی محفوظ طریقے سے پہنچ جائے بلکہ اس بات کی نگہبانی بھی کرتے ہیں کہ رسول اپنے رب کے پیغامات اس کے بندوں تک بے کم و کاست پہنچا دے۔

۳۰ یعنی رسول پر بھی اور فرشتوں پر بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت اس طرح محیط ہے کہ اگر بال برابر بھی وہ اس کی مرضی کے خلاف جنبش کریں تو فوراً گرفت میں آ جائیں، اور جو پیغامات اللہ تعالیٰ بھیجتا ہے ان کا حرف حرف گِنا ہُوا ہے، رسولوں اور فرشتوں کی یہ مجال نہیں ہے کہ ان میں ایک حرف کی کمی بیشی کر سکیں۔

تصحیح

تفہیم القرآن میں حسب ذیل مقامات پر اصلاح کر لی جائے:

جلد اول، صفحہ ۱۷۰، سطر ۲۰ "رکوع ۳۱ کی آخری آیت" کے بجائے آیت ۲۴۱۔

جلد دوم، صفحہ ۹۴، سطر ۴۔ اَجْرُ الْمُصْلِحِيْنَ کے بجائے اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ

عدالتِ صحابہؓ

(۴)

(ملک غلام علی صاحب)

قتلِ حجرؓ اور دیت و توریث مدیر "البلاغ" کے بقول "خلافت و ملوکیت" میں حضرت معاویہؓ کے خلاف جو "چارج شیٹ" مرتب کی گئی ہے۔ ان میں سے تخویف و تہدید کے استعمال کا ثبوت صحیح البخاری سے گزشتہ ترجمان میں پیش کیا جا چکا ہے۔ اس الزام کے علاوہ مولانا محمد تقی عثمانی کے خیال میں جو الزام مولانا مودودی نے امیر معاویہؓ کے سر جیپک دیتے ہیں وہ یہ ہیں کہ امیر معاویہؓ نے حُجر بن عَدِی جیسے زاہد و عابد صحابی کو محض حق گوئی کی وجہ سے قتل کیا، مسلمان کو کافر کا وارث قرار دینے کی بدعت جاری کی، اور دیت کے احکام میں تبدیلی کر کے آدھی دیت خود لینی شروع کر دی۔ میری گزارش یہ ہے کہ حضرت حُجرؓ بن عدی کے قتل سے انکار تو عثمانی صاحب کو بھی نہیں ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ قتل کی وجہ کیا تھی اور قتل جائز تھا یا نہیں، تو اس پر جو کچھ میں نے لکھا ہے، اس کا کوئی جواب اب تک عثمانی صاحب یا کسی دوسرے صاحب نے نہیں دیا مگر حضرت حُجرؓ کے نام کے ساتھ رضی اللہ عنہ تک لکھنا انہیں گوارا نہیں ہے۔ فرض کیا کہ حضرت حجرؓ کی صحابیت ان حضرات کے نزدیک مختلف فیہ ہے، تب بھی ان کے نام پر رضؓ کی علامت بنا دینے سے کسی کی جیب میں سے کچھ نہیں جاتا۔ آخر کثیرؓ بن شہاب، جن کی گواہی زیاد نے حضرت حجرؓ کے خلاف درج کی تھی اور جو حضرت حجرؓ کو ہتھکڑیاں پہنا کر لے گئے تھے، ان کے ساتھ تو "البلاغ" میں ہر جگہ رضؓ لکھا گیا ہے حالانکہ ان کی صحابیت میں بھی بہت اختلاف ہے۔ خود میں نے بھی انہیں رضی اللہ عنہ ہی لکھا ہے اور اس میں تأمل محسوس نہیں کیا۔ اسی طرح کوئی اس سے بھی انکار نہیں کر سکتا کہ امیر معاویہؓ نے توریث مسلم من الکافر کا نیا قاعدہ جاری کیا اور غیر مسلم کی دیت کا آدھا حصہ وارثوں کو دینے کے بجائے خود لیا (یا

بیت المال میں لیا)۔ اس چیز کو اُمت کے کسی مسلک میں قبول نہیں کیا گیا ہے، حتیٰ کہ ان کے اپنے خاندان کے ایک فرد حضرت عمر بن عبد العزیز نے بھی اسے تبدیل کرنا ضروری سمجھا۔ اس طریقے کا خلاف کتاب و سنت ہونا میں پوری طرح واضح کر چکا ہوں۔ اس پر بدعت کا اطلاق بھی علمائے امت کر چکے ہیں۔ ان میں سے ایک حوالہ میں یہاں نقل کیے دیتا ہوں۔ مشہور حنفی فقیہ امام ابوبکر جصاص نے اپنی کتاب احکام القرآن میں جہاں احکام وراثت پر بحث کی ہے، وہاں وہ ایک باب من یحرم المیراث مع وجود النسب کے تحت فرماتے ہیں:

قال مسروق ما احدث فی الاسلام قضیۃ اعجب من قضیۃ قضاھا معاویۃ کان یورث المسلم من الیھودی والنصرانی (مسروقؒ تابعی نے فرمایا کہ اسلام میں اس سے زیادہ عجیب فیصلے کی جدت طرازی نہیں کی گئی جیسی کہ معاویہؓ نے کی تھی کہ آپ مسلمان کو یہودی اور نصرانی کا وارث قرار دیتے تھے)۔

اس کے بعد جصاص حضرت مسروق ہی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ آخر کار حضرت عمرؒ بن عبد العزیز نے اسے بدل دیا۔ امیر معاویہؓ نے زیاد کے ذریعے سے قاضی شریحؒ کو اپنے فیصلے کے مطابق عمل کرنے کا حکم دیا تھا۔ چنانچہ شریح اس پر عمل تو کر دیتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ اعلان کر دیتے تھے کہ یہ امیر المومنین کا فیصلہ ہے لیکن زہری، علی بن حسین سے، وہ عمروؓ بن عثمان سے اور وہ اسامہؓ بن زید سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا یتوارث اھل ملتین ولا یرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم۔ اس کے بعد الجصاص امیر معاویہؓ کے فیصلے کا شدت سے مفصل رد کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ محض تاویلات اور مشکوک احتمالات کے بل پر نص قطعی کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ پوری بحث کے آخر میں جصاص پھر فرماتے ہیں:

واما قول مسروق ما احدث فی الاسلام قضیۃ اعجب من قضیۃ قضی بھا معاویۃ فانہ یدل علی بطلان ھذا المذھب لاخبارہ انھا قضیۃ محدثۃ فی الاسلام وذالک یوجب ان یکون قبل قضیۃ معاویۃ لم یکن یورث المسلم من الکافر واذا ثبت ان من قبل قضیۃ معاویۃ لم یکن یورث المسلم من الکافر وان معاویۃ لا یجوز

ان یکون خلافا علیہم بل ھو ساقط القول معہم۔

"اور حضرت مسروق نے یہ جو فرمایا کہ اسلام میں حضرت معاویہؓ کے فیصلے سے زیادہ نرالا فیصلہ نہیں کیا گیا، تو مسروق کا یہ قول اس فیصلے کے باطل ہونے پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ انہوں نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ فیصلہ اسلام میں ایک نئی بدعت ہے اور ان کے اس قول سے یہ لازم آتا ہے کہ حضرت معاویہؓ کے اس فیصلے سے پہلے مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوتا تھا۔ اور یہ ثابت ہوگیا کہ امیر معاویہؓ کے فیصلے سے پہلے مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوتا تھا اور حضرت معاویہؓ کے لیے یہ جائز نہیں تھا کہ وہ اپنے پیش روؤں کی مخالفت کریں، بلکہ اُن کے قول کی موجودگی میں حضرت معاویہؓ کا قول ساقط ہے" (احکام القرآن، الجصاص، الجزء الثانی، ص ۱۲۳۔ المطبعۃ البہیۃ، مصر، ۱۳۴۷ھ)۔

اس بحث کو پڑھ کر ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس میں حضرت مسروقؒ اور ابوبکر جصاصؒ بار بار امیر معاویہؓ کے فیصلے کو قضیّہ مُحدَثہ کہہ رہے ہیں اور اسی کا دوسرا نام بدعت ہے بلکہ بدعت کے مقابلے میں احداث اور مُحدَث کے الفاظ سخت تر ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے: من احدث فی امرنا فھو رد (جس نے دین میں احداث کیا، وہ قابلِ ردّ ہے)، نیز فرمایا کل محدثۃ بدعۃ وکلّ بدعۃ ضلالۃ (ہر امرِ محدث بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے)۔

سبِّ علیؓ کا مزید ثبوت ربیع الثانی ۱۳۸۹ھ کے ترجمان القرآن میں احادیثِ صحیحہ اور محدثین و مورخین کے مستند اقوال سے میں یہ ثابت کرچکا ہوں کہ امیر معاویہؓ اور ان کے گورنر حضرت علیؓ اور اہلِ بیت پر سبّ وشتم کرتے تھے۔ لیکن چار ماہ بعد میری کسی بات کو غلط ثابت کیے بغیر رجب ۱۳۸۹ھ کے البلاغ میں پھر وہی بات دہرا دی گئی کہ مولانا مودودی نے جو الزامات امیر معاویہؓ کے سر تھوپے ہیں، ان میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے حضرت علیؓ پر خود سرِ منبر سبّ وشتم کرنے کی بدعت جاری کی۔ اس بحث میں عثمانی صاحب نے ابن حجرؒ مکی کا یہ قول بھی تطہیر الجنان سے نقل کیا ہے کہ:

"صحابہ کرام کے درمیان جو واقعات ہوئے کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ انہیں ذکر

کرکے ان کے نقص پر استدلال کرے۔ یہ کام صرف اہلِ بدعت کا ہے اور بعض ان جاہل ناقلوں کا جو ہر اُس چیز کو نقل کر دیتے ہیں جو انہوں نے کہیں دیکھ لی ہو اور اس سے اس کا ظاہری مفہوم ہی مراد لیتے ہیں، نہ اس روایت کی سند پر طعن کرتے ہیں، نہ اس کی تاویل کی طرف اشارہ کرتے ہیں، یہ بات سخت حرام و ناجائز ہے کیونکہ اس سے فسادِ عظیم رونما ہوتا ہے اور یہ عام لوگوں کو صحابہؓ کے خلاف اکسانے کے مترادف ہے، حالانکہ ہم تک دین کے پہنچنے کا واسطہ یہی صحابہؓ ہیں جنہوں نے قرآن و سنّت کو ہم تک نقل کیا ہے۔"

اب ملاحظہ ہو کہ یہی ابن حجرؒ اپنی اسی کتاب "تطہیر الجنان واللسان عن الخطور والتفوہ بثلب سیدنا معاویۃ بن ابی سفیان میں صفحہ ۴۰ پر اسی سب و شتم کے مسئلے میں کیا فرماتے ہیں۔ حضرت علیؓ کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

لما وقع من الاختلاف والخروج علیہ نشر من سمع من الصحابۃ تلک الفضائل وبثھا نصحاً للامۃ ایضاً ثم لما اشتد الخطب واشتغلت طائفۃ من بنی امیۃ بتنقیصہ وسبّہ علی المنابر ووافقھم الخوارج لعنھم اللہ بل قالوا بکفرہ اشتغلت جھابذۃ الحفاظ من اھل السنۃ ببث فضائلہ حتی کثرت للامۃ ونصرۃ للحق۔[1]

(جب اختلاف رونما ہوا اور حضرت علیؓ کے خلاف خروج کیا گیا تو حضرت علیؓ کے فضائل جن صحابۂ کرام نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنے تھے، انہوں نے اُمّت کی خیر خواہی کے لیے ان فضائل کی نشر و اشاعت شروع کی۔ پھر جب حضرت علیؓ کی مخالفت میں مہم زور پکڑ گئی اور بنو امیہ کے ایک گروہ نے منبروں پر اُن کی تنقیص اور سب و شتم کو اپنا مشغلہ بنا لیا اور خوارج نے بھی (اللہ ان پر لعنت کرے) ان مخالفین کا ساتھ دیا بلکہ حضرت علیؓ کی تکفیر تک کر ڈالی، تو اہلِ سنت کے بڑے بڑے ناقدینِ حدیث، جنہیں احادیثِ نبوی حفظ تھیں انہوں نے

[1] تقریباً یہی بات حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری، کتاب المناقب میں فرمائی ہے جو میں سبِّ علی کی بحثِ سابق میں نقل کر چکا ہوں۔

حضرت علیؓ کے فضائل و مناقب میں مروی حدیثوں کو پھیلایا یہاں تک کہ امت میں ان کی کثیر تعداد کا چرچا ہو گیا اور نصرتِ حق کا تقاضا پورا ہو گیا)۔

اب مولانا محمد تقی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ الزام زبردستی گھڑ کر امیر معاویہؓ اور آپ کے گورنروں کے خلاف عائد کر دیا گیا ہے کہ وہ منبروں پر چڑھ کر حضرت علیؓ پر سب و شتم کرتے تھے، حالانکہ ابن حجر مکی جن کا قول عثمانی صاحب نے نقل کیا ہے، وہ خود اپنی اسی کتاب میں یہ بات ایک مسلّمہ و مصدقہ واقعہ کے طور پر بیان فرما رہے ہیں کہ حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت میں بنو امیہ اور خوارج ایک دوسرے کی ہمنوائی میں حضرت علیؓ کی تنقیص اور ان پر سب و شتم میں مشغول رہتے تھے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ پبلک پلیٹ فارم اور منبر امیر معاویہؓ اور آپ کے گورنروں ہی کے زیرِ تصرف تھے اور جس اختلاف، خروج اور حضرت علیؓ کے خلاف شور و شغب اور ہنگامے کا یہاں ذکر ہے یہ حضرت علیؓ کے حینِ حیات اور آپ کی خلافت کے دوران ہی میں برپا کیا گیا تھا۔

خلافت و ملوکیت میں سب و شتم کے ثبوت میں جو روایات درج ہیں، ان میں سے ایک مروان کے متعلق ہے کہ وہ ہر جمعے کو حضرت علیؓ پر لعن طعن کرتا تھا۔ "البلاغ" میں اس کی تردید پر بھی بڑا زور صرف کیا گیا ہے اور ایک ایک راوی کی خوب کھال ادھیڑی گئی ہے۔ اگرچہ میں اس کا مفصّل جواب پہلے دے چکا ہوں، تاہم میں انہی ابنِ حجرؒ کی اسی کتاب تطہیر الجنان کی ایک روایت مزید نقل کرتا ہوں جو مروان ہی کے متعلق ہے۔ فرماتے ہیں:

فی روایۃ للبزار لقد لعن اللّٰہ الحکمَ وما ولد علی لسان نبیّہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وبسندٍ رجالہ ثقات ان مروان لما ولی المدینۃ کان یسبّ علیاً علی المنبر کل جمعۃ، ثم ولی بعدہ سعید بن العاص فکان لا یسب، ثم اعید مروان فعاد للسب وکان الحسن یعلم ذالک فسکت ولا یدخل الا عند الاقامۃ۔ فلم یرض بذالک مروان حتی ارسل للحسن فی بیتہ بالسب البلیغ لابیہ ولہ ومنہ "ما وجدت مثلک الا مثل البغلۃ یقال لھا من ابوک فتقول اُمّی الفرس" فقال للرسول ارجع الیہ فقل لہ واللّٰہ لا امحو عنک شیئاً مما قلت بانی اسبّک، ولکن موعدی وموعدک

اللہ۔ فان کنت کاذباً فاللہ اشدّ نقمۃ۔ فقد اکرم جدی ان یکون مثلی مثل البغلۃ۔ فخرج الرسول فلقی الحسین فاخبرہ بذالک السب۔ بعد مزید تمنع وتھدید من الحسین ان لم یخبرہ، فقال بل وتیا مل بابیک وقومک وایۃ ما بینی، حینک ن تمسک منکبیک من لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ۔ ۔ ۔ ۔ وبسند حسن ان مروان قال لعبد الرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما انت الذی نزل فیہ وَ الَّذِیۡ قَالَ لِوَالِدَیۡہِ اُفٍّ لَّکُمَاۤ ۔ ۔ ۔ فقال لہ عبد الرحمٰن کذبت ولکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم لعن اباک۔

(بزّار کی روایت میں ہے کہ اللہ نے حکَم (والدِ مروان) اور اس کی اولاد پر لعنت کی لسانِ نبوی کے ذریعے سے۔ اور ثقہ راویوں کی سند کے ساتھ مروی ہے کہ جب مروان کو مدینے کا گورنر بنایا گیا تو وہ منبر پر ہر جمعے میں حضرت علیؓ پر سب و شتم کرتا تھا۔ پھر اس کے بعد حضرت سعید بن عاص گورنر بنے تو وہ سبِّ علیؓ کا ارتکاب نہیں کرتے تھے پھر مروان کو دوبارہ گورنر بنایا گیا تو اس نے پھر سبّ و شتم شروع کر دی۔ حضرت حسنؓ کو اس کا علم تھا مگر آپ خاموش رہتے اور مسجد نبوی میں عین اقامت کے وقت داخل ہوتے تاکہ اپنے والدِ ماجد کی بدگوئی نہ سُن سکیں)۔ مگر مروان اس پر بھی راضی نہ ہوا یہاں تک کہ اس نے حضرت حسنؓ کے گھر میں ایلچی کے ذریعے ان کو اور حضرت علیؓ کو گالیاں دلوا بھیجیں۔ ان ہفوات میں سے ایک یہ بات بھی تھی کہ "تیری مثال میرے نزدیک خچر کی سی ہے کہ جب اس سے پوچھا جاتے کہ تیرا باپ کون ہے، تو وہ کہے کہ میری ماں گھوڑی ہے۔" حضرت حسنؓ نے سن کر قاصد سے کہا کہ تو اس کے پاس جا اور اس سے کہدے کہ "خدا کی قسم میں تجھے گالی دے کر تیرا گناہ ہلکا نہیں کرنا چاہتا۔ میری اور تیری ملاقات اللہ کے ہاں ہو گی۔ اگر تو جھوٹا ہے تو اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے اللہ نے میرے نانا جان (صلی اللہ علیہ وسلّم) کو جو شرف بخشا ہے وہ اس سے بلند و برتر ہے کہ میری مثال خچر کی سی ہو۔" ایلچی نکلا تو حسینؓ سے اس کی ملاقات ہو گئی

اور انہیں بھی اس نے گالیوں کے متعلق بتایا۔ حضرت حسینؓ نے اُسے پہلے تو دھمکی دی کہ خبردار جو تم نے میری بات بھی مروان تک نہ پہنچائی اور پھر فرمایا کہ "اے مروان تو ذرا اپنے باپ اور اس کی قوم کی حیثیت پر بھی غور کر۔ تیرا مجھ سے کیا سروکار، تو اپنے کندھوں پر اپنی اس اولاد کو اٹھاتا ہے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہے"۔ . . . . اور عمدہ سند کے ساتھ یہ بھی مروی ہے کہ مروان نے عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما سے کہا کہ تو وہ ہے جس کے بارے میں قرآن کی یہ آیت اتری "جس نے کہا اپنے والدین سے کہ تم پر اُف ہے" . . . . عبدالرحمٰن کہنے لگے "تو نے جھوٹ کہا، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرے والد پر لعنت کی تھی"۔

مروان کی بدزبانی کا یہ پورا واقعہ علاوہ دیگر مورخین کے امام جلال الدین سیوطیؒ نے تاریخ الخلفاءؒ میں بھی نقل کیا ہے اور متعدد دوسرے علماء نے اس کو بیان کیا ہے۔ میں نے قصداً اُسے پہلے نظرانداز کیا تھا مگر مدیرہ "البلاغ" کے غلط موقف پر اصرار کو دیکھ کر مجبوراً اب مجھے بھی نقل کرنا پڑا۔

امیر معاویہؓ کے عہد میں حضرت علیؓ و اہلِ بیتِ نبیؐ پر سب و شتم کا آغاز ایک مانی ہوئی تاریخی حقیقت ہے اور یہ امر بھی مسلّم ہے کہ مروان نے اس کام میں نہایت نمایاں حصّہ لیا ہے۔ متعدد مؤرخین نے اس بات کی صراحت بھی کی ہے کہ حضرت سعیدؓ بن العاص جو مدینے کے گورنر تھے، انہیں معزول کر کے مروان کو یہ عہدہ اس لیے دیا گیا تھا کہ حضرت سعید سبّ و شتم میں حصّہ لینے پر رضامند نہ تھے۔ ابن کثیر، البدایہ ج ۸ صـ۸۷ پر حضرت سعیدؓ کے متعلق لکھتے ہیں:

ولاہ المدینۃ مرتین وعزلہا مرتین بمروان بن الحکم وکان سعید ھذا لا یسبّ علیاً ومروان یسبّہ۔

(امیر معاویہؓ نے انہیں دو مرتبہ مدینے کا والی بنایا اور دونوں مرتبہ مروان کے بدلے میں انہیں معزول کر دیا۔ یہ سعیدؓ بن العاص حضرت علیؓ پر سب و شتم نہیں کرتے تھے اور مروان سبِّ علیؓ کا ارتکاب کرتا تھا)۔

یہ قول جہاں مروان کی بدگوئی واضح کرتا ہے، وہیں اس بات کو بھی ثابت کرتا ہے کہ جو گورنر سب وشتم نہیں کرتا تھا اس کی گورنری چھین کر ایسے شخص کے سپرد کردی جاتی تھی جو اس فعل کو سرانجام دیتا تھا۔ پھر حضرت سعیدؓ کے بارے میں منفی طور پر یہ کہنا کہ کان لایسبّ علیاً، صاف طور پر یہ بھی بتا رہا ہے کہ سبّ علیؓ کا طریقہ عام تھا، ورنہ حضرت سعیدؓ جن کا علم، تقویٰ، تدیّن اور جن کے مجاہدانہ کارنامے معروف ومشہور ہیں اور جنہوں نے بنوامیہ کے ممتاز فرد اور حضرت عثمانؓ کے ربیب ہونے کے باوجود جنگِ جمل وصِفّین سے بالکل کنارہ کشی کی، ان کے بارے میں آخر یہ صراحت کیوں ضروری سمجھی گئی کہ وہ حضرت علیؓ پر سب وشتم نہیں کرتے تھے؟

ابن تیمیہؒ کے اقوال | مدیر "البلاغ" نے علامہ ابنِ تیمیہؒ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ "جن روایات سے صحابۂ کرام کی برائیاں معلوم ہوتی ہیں، ان میں سے کچھ تو جھوٹ ہی جھوٹ ہیں اور کچھ ایسی ہیں کہ ان میں کمی بیشی کردی گئی ہے اور ان کا اصلی مفہوم بدل دیا گیا ہے"۔ اس کے بعد عثمانی صاحب پوچھتے ہیں کہ جن تاریخی روایات کی بنا پر مولانا مودودی آج حضرت معاویہؓ کو "حقیقی غلطی" کا مجرم قرار دے رہے ہیں کیا ابنِ تیمیہؒ اور دوسرے علماء ان تاریخی روایتوں سے بے خبر تھے یا اتنے کم فہم تھے کہ وہ اجتہادی غلطی اور حقیقی غلطی میں تمیز نہیں کرسکتے تھے؟ میں اس کے جواب میں امام ابن تیمیہؒ ہی کے چند اقوال پیش کرتا ہوں۔ منہاج السنہ جلد ثانی صفحہ ۲۱۹ پر آپ حضرت معاویہؓ کے متعلق فرماتے ہیں:

کان من احسن الناس سیرۃً فی ولایتہ وھو ممن حسن اسلامہ ولولا محاربتہ لعلی رضی اللہ تعالٰی عنہ وتولیتہ الملک لم یذکرہ احد الا بخیر کما لم یذکر امثالہ الا بخیر۔

(امیر معاویہؓ اپنی حکومت میں اپنے طرزِ عمل کے اعتبار سے بہترین لوگوں میں سے تھے اور مخلص مسلمان تھے اور اگر آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محاربت نہ کرتے اور اپنے اقتدار میں ملوکیت کا طریقہ اختیار نہ کرتے تو کوئی شخص بھی ان کا ذکر اچھائی کے بغیر نہ کرتا جس طرح کہ آپ جیسے دوسرے صحابہ کرام کا ذکرِ خیر کیا جاتا ہے)۔

پھر اسی کتاب کے جزء ثالث ص ۱۶۹ پر مصنف فرماتے ہیں :

وابو سفیان کان فیہ بقایا من جاھلیۃ العرب یکرہ ان یتولی علی الناس رجل من غیر قبیلتہ۔ (اور ابو سفیان میں جاہلیتِ عرب کے بقایا موجود تھے جن کی بنا پر وہ اپنے قبیلے کے سوا کسی دوسرے شخص کا امیر بننا ناپسند کرتے تھے)۔

آگے چوتھی جلد کے ص ۱۷۰ پر ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

ولم یتھم احد من الصحابۃ والتابعین معاویۃ بنفاق واختلفوا فی ابیہ

(منہاج السنۃ النبویۃ فی نقض الشیعۃ، مطبعہ امیریہ، مصر، ۱۹۲۱ء)

(صحابہ کرام و تابعین میں سے کسی نے بھی امیر معاویہؓ پر تو نفاق کی تہمت نہیں لگائی لیکن ابو سفیانؓ کے معاملے میں ان کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے)۔

اب ظاہر ہے کہ امام ابن تیمیہؒ نے جو رائے امیر معاویہؓ یا ان کے والد ماجد کے متعلق ظاہر کی ہے، وہ ایسی روایات پر تو مبنی نہ ہو گی جو جھوٹ ہی جھوٹ ہوں اور نہ ابن تیمیہؒ بقول عثمانی صاحب اتنے کم فہم ہو سکتے تھے کہ وہ اجتہادی غلطی کے لیے ذکرِ خیر کے فقدان، جاہلیت اور ملوکیت وغیرہ کے الفاظ استعمال کرتے۔

ہر بدعت و فسق منافی عدالت نہیں "البلاغ" میں چونکہ یہ سوال خاص طور پر اٹھایا گیا ہے کہ کسی صحابی یا کسی راوی کی جانب بدعت کے انتساب کے بعد اس کی بیان کردہ حدیث کیسے قابلِ قبول ہو سکتی ہے، اس لیے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس مسئلے پر بھی مختصر بحث کر دوں کہ راویٔ حدیث کے کسی قول و فعل پر بدعت کا اطلاق اس کی مرویات میں کس حد تک قادح ہو سکتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ بالعموم سنّت کے بالمقابل بدعت کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور جن فرقوں یا گروہوں کا مسلک بنیادی طور پر اہلِ سنت سے مختلف ہے، ان کو اہلِ بدعت و ھَویٰ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ صحابۂ کرام کے دورِ سعادت کے بعد تابعین، تبع تابعین اور ائمہ محدثین کے ہاں اس پر اکثر بحثیں ہوتی رہی ہیں کہ اہلِ سنت کے ماسوا دوسرے گروہوں کے افراد سے اخذِ حدیث جائز ہے یا نہیں۔ ان بحثوں کے مطالعے سے جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ جمہور محدثین اس امر کے قائل نہیں ہیں کہ اہلِ بدعت کی روایت کردہ احادیث کو مطلقاً رد کر دیا جائے اور ان کے کسی شخص

کی کسی حدیث کو نہ لیا جائے۔ امام ذہبیؒ نے رجالِ حدیث کی جرح و تعدیل پر اپنی کتاب "میزان الاعتدال" میں جا بجا اصولی بحث کی ہے۔ ابان بن تغلب جو اہلِ تشیّع میں سے تھے اور جن کی روایات صحیح مسلم میں موجود ہیں، ان کے حالات بیان کرتے ہوئے امام ذہبیؒ فرماتے ہیں:

فان قیل کیف ساغ توثیق مبتدع وحد الثقة العدالة والاتقان، فکیف یکون عدلًا وھو صاحب بدعة؟ فجوابه ان البدعة علی ضربین فبدعة صغری کغلو التشیع او التشیع بلاغلو ولا تحرق فھذا کثیر فی التابعین و تابعیھم مع الدین والورع والصدق فلو ذھب حدیث ھؤلاء لذھب جملة من الآثار النبویة وھذہ مفسدة بیّنة ثم بدعة کبری کالرفض الکامل والغلو فیه والحط علی ابی بکر وعمر رضی اللہ عنھما والدعاء الی ذالك فھذا النوع لا یحتج بھم۔ (اگر یہ کہا جائے کہ ایک مبتدع کی توثیق کیسے جائز ہو گی حالانکہ عدالت و اتقان کی شرطِ ثقاہت کے لیے لازم ہے، پھر ایک راوی جو صاحبِ بدعت ہے، وہ عادل کیسے ہو گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بدعت دو قسم کی ہے۔ ایک تو بدعتِ صغریٰ ہے مثلاً تشیّع میں غلو کرنا یا غالی اور کٹر شیعی نہ ہونا تو یہ چیز تابعین اور تبع تابعین کی کثیر تعداد میں تھی باوجود اس کے کہ ان میں دین، تقویٰ اور سچائی بھی موجود تھی۔ پس اگر ان کی روایت کردہ احادیث ترک کر دی جائیں تو احادیثِ نبویہ کا بہت بڑا حصہ ضائع ہو جائے گا اور یہ ایک واضح مفسدہ ہو گا۔ دوسری بدعتِ کبریٰ ہے جس کی مثال کامل رفض اور اس میں غلو ہے جس کے حامل حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی تنقیص کرتے ہیں اور دوسروں کو اس کی دعوت دیتے ہیں، اس قسم کے لوگوں کی روایات قابلِ حجت نہیں)۔

اس سے معلوم ہوا کہ تابعین اور تبع تابعین میں بکثرت حضرات ایسے تھے جن میں اس حد تک تشیّع موجود تھا جس پر بدعتِ صغریٰ کا اطلاق کیا گیا ہے، اس کے باوجود چونکہ وہ صادق القول تھے اور شیخین کی توہین نہیں کرتے تھے، اس لیے ان کی حدیث کو ترک نہیں کیا گیا، نہ ان کی عدالت و ثقاہت میں شک

کیا گیا۔ بلکہ محدثین کا ارشاد یہ ہے کہ اگر ان لوگوں کی روایت کردہ احادیث قبول نہ کی جائیں تو حدیث کا بڑا ذخیرہ ایسا ہوگا جس سے ہاتھ دھونے پڑیں گے اور یہ بہت بڑی قباحت ہوگی۔

حافظ ابنِ حجرؒ عسقلانی نے اپنی تصنیف نزہتہ النظر شرح نخبۃ الفکر میں جہاں راوی کے اسبابِ طعن پر بحث کی ہے، وہاں بدعت پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

البدعة اما ان تکون بمکفّرٍ کان یعتقد ما یستلزم الکفر او بمفسّقٍ.....

.... والتحقیق انہ لا یردّ کل مکفّر ببدعة لان کل طائفة تدّعی ان مخالفیہا مبتدعة وقد تبالغ فتکفر مخالفیہا فلو اخذ ذالک علی الاطلاق لاستلزم تکفیر جمیع الطوائف۔ فالمعتمد ان الذی ترد روایتہ من انکر متواترا من الشرع معلوماً من الدین بالضرورة۔

(بدعت کی ایک قسم کا اطلاق ایسے قول و فعل پر ہوتا ہے جس کا مرتکب یا معتقد کفر کی حد تک جا پہنچتا ہے یا پھر فسق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں تحقیقی موقف یہ ہے کہ ہر صاحبِ بدعت کی روایت کو رد نہیں کیا جائے گا گو کہ اس کی تکفیر ہی کی جا رہی ہو، کیونکہ ہر گروہ کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کے مخالفین مبتدع ہیں اور ہر گروہ مبالغے سے کام لے کر اپنے مخالفین کی تکفیر کر ڈالتا ہے، تو اگر ہر ایک کا قول علی الاطلاق مانا جائے تو ہر گروہ کی تکفیر لازم آئے گی۔ پس جو قول قابلِ اعتماد ہے وہ یہ ہے کہ روایت صرف اس کی رد کی جائے گی جو کسی ایسے امر شرعی کا منکر ہو جو تواتر سے ثابت ہو یا ضروریاتِ دین میں سے اس کا ہونا معلوم ہو)۔

حافظ ابن حجرؒ کی تحقیق سے یہ بات واضح ہوگئی کہ کسی راوی کو اس کے مخالفین خواہ بدعت، فسق، حتیٰ کہ کفر کا مرتکب کیوں نہ قرار دے دیں جب تک وہ متواترات و ضروریاتِ دین میں سے کسی امر کا انکار نہ کرے، اس کی حدیث کو علی الاطلاق رد نہیں کیا جا سکتا۔

اہلِ بدعت سے روایت | اہلِ بدعت کا اطلاق شیعوں کے علاوہ نواصب و خوارج اور قدریہ وغیرہ پر

بھی کیا جاتا ہے۔ اب ناصبیوں کا حال یہ ہے کہ وہ حضرت علیؓ اور اہلِ بیت کے خلاف ایک میل اور عناد اپنے دل میں رکھتے ہیں اور خوارج کا مسلک یہ تھا کہ وہ ہر مرتکب کبیرہ کو کافر و مرتد قرار دے کر اس کی جان و مال کو بالکل حلال سمجھتے تھے۔ یہ لوگ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو چھوڑ کر حضرت معاویہؓ، حضرت علیؓ اور بہت سے صحابۂ کرام تک کی تکفیر کرتے تھے، بلکہ بعض صحابہؓ ان ظالموں کے ہاتھوں محض اس بنا پر شہید ہوئے کہ وہ ان کے گمراہانہ عقائد و اعمال میں ان کی ہمنوائی پر تیار نہ تھے۔ اس کے باوجود ان گروہوں سے حدیث اخذ کی گئی ہے بلکہ خوارج کی مرویات کو تو اس لیے قابلِ اعتماد سمجھا گیا کہ جب وہ جھوٹ بولنے کو موجبِ تکفیر سمجھتے ہیں اور جھوٹے کو واجب القتل سمجھتے ہیں تو وہ جھوٹی حدیث گھڑنے یا بیان کرنے کی جرأت کیسے کریں گے؟ امام ابوداؤد کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ لیس فی اھل الاھواءِ اصحّ حدیثا من الخوارج (اہلِ بدعت و ہوا میں خوارج سے بڑھ کر کوئی دوسرا گروہ صحیح الحدیث نہیں ہے)۔ الکفایہ میں اس موضوع پر ایک مستقل باب موجود ہے، جس کا عنوان ہے: ما جاء فی اخذ عن اھل البدع والاھواء والاحتجاج بروایاتھم (اہلِ بدعت و اہواء کی مرویات کو قبول کرنے اور انہیں حجت ماننے کے بارے میں)۔ اس باب میں امام شافعی کا قول منقول ہے:

"تقبل شھادۃ اھل الاھواء الا الخطابیۃ من الرافضۃ لانھم یرون الشھادۃ بالزور لموافقیھم (اور اہلِ بدعت کی شہادت قبول کی جائے گی سوائے خطابیہ کے جو روافض کی ایک شاخ ہیں، کیونکہ یہ لوگ اپنے ہمنواؤں کے حق میں جھوٹی گواہی کے قائل ہیں)۔[1]

ابنِ ابی لیلیٰ، سفیانؒ ثوری اور قاضی ابویوسفؒ کا مسلک بھی یہی بیان کیا گیا ہے۔ اس مسئلے پر مفصل بحث کے بعد الخطیب نے آخر میں اپنی رائے درج کی ہے جو درجِ ذیل ہے:

والذی یعتمد علیہ فی تجویز الاحتجاج باخبارھم اشتھر من قبول الصحابۃ اخبار الخوارج وشھاداتھم ومن جری مجراھم من الفساق بالتاویل۔ ثم استمرار عمل التابعین والخالفین بعدھم علی ذلک لما رأوا من تحریھم الصدق وتعظیمھم

[1] امام شافعیؒ کا یہ قول امام نوویؒ نے شرح مسلم کے دیباچے میں بھی نقل کیا ہے۔

الكذب وحفظهم انفسهم عن المحظورات من الافعال وانكارهم على اهل الريب والطرائق لمذمومة ورواياتهم الاحاديث التى تخالف آراءهم وتتعلق بها مخالفوهم فى الاحتجاج عليهم۔ فاحتجوا برواية عمران بن حطان وهو من الخوارج وعمرو بن دينار وكان ممن يذهب الى القدر والتشيع وكان عكرمة اباضياً و ابن ابى نجيح وكان معتزليا وعبد الوارث بن سعيد وشبل بن عباد وسيف بن سليمان وهشام الدستوائى وسعيد بن ابى عروبة وسلام بن مسكين وكانوا قدريه۔ وعلقمة بن مرثد وعمرو بن مرة ومسعر بن كدام وكانوا مرجئة و عبيد الله بن موسیٰ وخالد بن مخلد وعبد الرزاق ابن همام وكانوا يذهبون الى التشيع فى خلق كثير يتسع ذكرهم۔ ودون اهل العلم قديماً وحديثاً رواياتهم واحتجوا باخبارهم فصار ذالك كالاجماع منهم وهو اكبر الحجج فى هذا الباب و به يقوى الظن فى مقارنة الصواب۔

"اہلِ بدعت وصوفی کی مرویات کے قابلِ حجت ہونے کے معاملے میں قابلِ اعتماد مسلک یہی ہے کہ خود صحابہ کرام نے خوارج کی روایات و شہادات کو قبول کیا ہے اور ان لوگوں کی احادیث کو بھی لیا ہے جنہوں نے کسی تاویل کی بنا پر ارتکابِ فسق کیا ہے۔ اس کے بعد تابعین اور تبع تابعین کا استمراری عمل بھی یہی رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرام و تابعین نے دیکھا کہ یہ خوارج اور اہلِ فسق روایتِ حدیث میں اتباعِ صدق کرتے تھے، کذب بیانی کو بڑا گناہ سمجھتے تھے، ممنوعات سے بچتے تھے، عاداتِ مذمومہ اور اہلِ ریب کو بُرا سمجھتے تھے اور ایسی احادیث بھی بیان کر دیتے تھے جو ان کی آراء کے خلاف پڑتی تھیں اور جن کی بنا پر ان کے مخالفین ان پر حجت قائم کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ محدثین نے عمران بن حطان سے حدیث لی ہے حالانکہ وہ خارجی تھا، عمرو بن دینار سے بھی لی ہے حالانکہ وہ قدریہ اور اہلِ تشیع کی طرف مائل تھا۔ اسی طرح عکرمہ اباضیہ[1] میں سے تھا اور ابن ابی نجیح

[1] یہ خوارج کے ایک اعتدال پسند گروہ کا نام ہے۔

معتزلی تھا۔ عبدالوارث بن سعید، شبل بن عباد، سیف بن سلیمان، ہشام دستوائی، سعید بن ابی عروبہ، سلام بن مسکین سب قدریہ میں سے تھے اور ان کی احادیث قبول کی گئی ہیں علقمہ بن مرثد اور عمرو بن مُرہ، مسعر بن کدام مرجئہ تھے، عبیداللہ بن موسیٰ، خالد بن مخلد، عبدالرزاق بن ھمام اہلِ تشیُّع میں سے تھے۔ اسی طرح کے اور بہت سے لوگ تھے جن کا ذکر باعثِ طوالت ہے۔ اہلِ علم نے ہر زمانے میں ان لوگوں کی روایات کو مدوّن کیا ہے اور ان سے حجت و استدلال کیا ہے اور اس پر ایک طرح کا اجماع ہو گیا ہے جو اس مسئلے میں سب سے بڑی دلیل ہے اور اس مسلک کے اقرب الی الصواب ہونے کو تقویت پہنچاتی ہے۔" (الکفایہ ص۱۲۵)

جن حضرات نے کتبِ رجال سے مراجعت محض "خلافت و ملوکیت" کے شوقِ مخالفت میں نہیں کی اور جن کی نگاہ محض واقدی و ابو مخنف کے تراجم ہی تلاش نہیں کرتی رہی، بلکہ جنہوں نے فنِ حدیث و رُواۃ حدیث کا کچھ مزید مطالعہ بھی کیا ہے۔ وہ اس سے بے خبر نہیں ہو سکتے کہ عمران بن حطان[1] جن کا ذکر

---

[1] عمران بن حطان (ف ۸۹ھ) کا شمار خوارج کے شیوخ و ائمہ میں کیا جاتا ہے۔ اس نے حضرت عائشہؓ اور حضرت ابو موسیٰؓ وغیرہ سے احادیث روایت کی ہیں جو بخاری، ابوداؤد اور نسائی میں مروی ہیں۔ عمران نے عبدالرحمٰن بن مُلجم قاتلِ علیؓ کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے، اس کے تین اشعار یہ ہیں:

یا ضربۃ من تقی ما اراد بھا الا لیبلغ من ذی العرش رضوانا

متقی (ابن ملجم) کی اس قاتلانہ ضرب کے کیا کہنے؟ اس حملے کا مقصود صرف عرش کے مالک کی رضامندی حاصل کرنا تھا)

انی لاذکرہ یوما فاحسبہ اوفی البریۃ عند اللہ میزانا

(میں جس دن بھی قاتلِ علیؓ کو یاد کرتا ہوں، تو میں اُسے عنداللہ ساری دنیا سے زیادہ بھرپور اجر کا حقدار سمجھتا ہوں)

اکرم بقوم بطون الطیر اقبرھم لم یخلطوا دینھم بغیاً و عدوانا

(یہ میری خوارج کی قوم کتنی معزّز ہے کہ پرندوں کے پیٹ ان کی قبریں بنتی ہیں (یعنی لڑائیوں میں کام آتے ہیں اور جنگلی پرندے ان کی بوٹیاں نوچتے ہیں) اور ان لوگوں نے اپنے دین میں بغی و عدوان کی آمیزش نہیں ہونے دی)۔

یہ اشعار البدایہ بمقتل علی، الکامل للمبرّد وغیرہ میں منقول ہیں۔

اوپر ہوا، یہ وہ صاحب ہیں جنہوں نے ابنِ ملجم قاتل علیؓ کی شان میں ایک باقاعدہ قصیدہ لکھا تھا۔
ہشام الدستوائی قدریہ فرقے سے تعلق رکھتا تھا اور صحاح ستہ کی ہر کتاب میں اس کی احادیث مروی ہیں۔
قدریہ کا عقیدہ ہے کہ ہر انسان اپنے ارادہ و عمل میں غیر محدود آزادی و قدرت رکھتا ہے۔ اگر کوئی شخص فقط امام سیوطی کی "تدریب الراوی فی شرح تقریب النواوی" پڑھ لے تو اُسے معلوم ہو جائیگا کہ صحیحین کے راویوں میں خارجی، شیعی، ناصبی، مرجئی، قدری خاصی تعداد میں موجود ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ محدثین نے بالعموم یہ پابندی لگائی ہے کہ اہلِ بدعت میں سے جو اپنے نظریات کا داعی نہ ہو، اس سے روایت لی جائے، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ داعیہ اور غیر داعیہ کی تفریق ایک اضافی شے ہے اور ایسے شخص کا تصور عقلاً محال ہے جو اپنے عقیدہ و مسلک کی کسی درجے میں تبلیغ نہ کرتا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو ان راویوں کے بارے میں سرے سے یہ بات مذکور و معلوم ہی کیسے ہوتی کہ وہ مبتدعانہ عقائد کے حامل تھے۔ چنانچہ ان میں سے متعدد، مثلاً یہی عمران اپنی خارجیت کا داعی تھا اور اس کا قصیدہ بھی اس کی دعوت ہی کا مظہر تھا۔ مدیر "البلاغ" جو عدالت اور بدعت و فسق کے مابین کلی منافات ثابت کرنا چاہتے ہیں، معلوم نہیں اس سوال کا کیا جواب دیں گے کہ ایسے راویوں کی روایات کتبِ صحاح میں کیسے راہ پاگئیں؟ مگر میرے نزدیک اس کا جواب بالکل سیدھا اور واضح ہے جسے پہلے بھی بیان کر چکا ہوں۔ جواب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے غلط رجحانات و میلانات کے باوجود صادق الحدیث تھے، ان کی عام روش تقویٰ و تدیّن اور ثقاہت و دیانت پر مبنی تھی۔ اس لیے ان کی روایات کو بلا تامل قبول کیا گیا۔ محدثین رحمہم اللہ نے جتنی محنت، عرق ریزی و دیدہ ریزی کے ساتھ ان لوگوں کے حالات کی چھان بین کی ہے صفحۂ ہستی پر کسی ایک انسانی گروہ نے کسی دوسرے گروہ کے حالات کو اس تفحّص و تفتیش کے ساتھ نہیں جانچا۔ جہاں انہیں ذرہ برابر بھی شبہ ہوا کہ راوی کے نظریات و عملیات اس کی روایت فی الحدیث کو متاثر کر سکتے ہیں، اس کو ترک کر دیا گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی دوسری طرف جب یقین یا ظنِ غالب حاصل ہو گیا کہ راوی کاذب یا متساہل نہیں تو بغیر کسی دغدغے کے اس کی روایت کو قبول کیا گیا۔ چنانچہ رجال کی کتابوں

میں بے شمار راوی ہیں جن کے ساتھ درج ہے: ثقۃ وکان مرجیا۔ صدوق الا انہ یری الارجاء۔ لم یتہمہ احد وکان ینسب الی الخوارج والقول بالقدر۔ احتج بہ الجماعۃ وکان یجالس قوما ینالون من علیؓ۔ ثقۃ الا انہ یتشیع۔ امام مالکؒ اسماعیل بن ابان کے بارے میں فرماتے ہیں: کان مائلا عن الحق الا انہ کان لایکذب فی الحدیث (وہ راہِ راست سے منحرف ہے مگر حدیث میں جھوٹ نہیں بولتا) امام بخاریؒ نے مروان کی حدیث نقل کی ہے اور ساتھ عروہؓ بن زبیرؓ کا قول درج کیا ہے: ان مروان کان لا یتہم فی الحدیث۔ (مروان روایت حدیث کے معاملے میں موردِ تہمت نہیں ہے)۔

میں سمجھتا ہوں کہ عدالتِ صحابہؓ اور عدالتِ رواۃ پر اتنی بحث کافی وشافی ہے۔ اب میں اس اہم اور نازک بحث کا خاتمہ بالخیر کرتے ہوئے ان دینی عناصر دافراد سے جو مولانا مودودی کی خبر لینے میں منہمک ہیں، ایک آخری اور دردمندانہ التماس کرتا ہوں کہ اس انتہائی نازک وقت میں آپ دوست اور دشمن میں امتیاز برتیں۔ ملحد، بے دین، سرمایہ دار، اشتراکی سرمایہ دار، منکرینِ سنت، منکرینِ نبوت سب کے سب مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کو اپنا دشمن نمبر ایک اس لیے نہیں سمجھتے کہ ہم نے خدانخواستہ انبیاء علیہم السلام یا صحابہ کرامؓ کی توہین کی ہے یا ہم اہل سنت کے مسلک سے منحرف ہوگئے ہیں، بلکہ وہ ہمیں اسلام اور خدا و رسول ہی کا خادم سمجھ کر ہمارے خلاف صف آرا ہیں۔ اب بھی اگر ہم نے باہمی خانہ جنگی جاری رکھی اور ہر اختلافی مسئلے میں ایک دوسرے کو توہینِ اسلام کا مرتکب قرار دیا تو اس کا فائدہ اعدائے اسلام ہی کو پہنچے گا۔ وما علینا الا البلاغ۔

ل ثقہ تھا حالانکہ مرجئی تھا۔ راستباز تھا مگر ارجاء کا قائل تھا (ارجاء کی ایک قسم یہ ہے کہ اقرارِ ایمان کے بعد کفارانہ اعمال و کبائر ضرر رساں نہیں ہوتے)۔ اُسے کسی نے متہم نہیں کیا حالانکہ وہ خارجیت و قدریت سے نسبت رکھتا تھا۔ محدثین کے ایک گروہ نے اس کی احادیث سے استناد کیا ہے حالانکہ وہ ناصبیوں سے مصاحبت رکھتا تھا۔ ثقہ تھا مگر شیعہ تھا۔

فقر و فاقہ اور اُس کا اسلامی حل

یوسف قرضاوی
تلخیص و ترجمہ :۔ عبدالحمید صدیقی

(۲)

جبریت کا نقطۂ نظر اور اسلام فقر و فاقہ کے متعلق جبریت کے نقطۂ نظر کی طرح اسلام رہبانیت کے نقطۂ نظر کی بھی تردید کرتا ہے۔ جبریوں کے خیال کے مطابق دولتمند چونکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی سے دولتمند ہے اور فقیر بھی اُس کی مشیت سے فقر و عسرت کی زندگی بسر کر رہا ہے، لہٰذا ہر شخص کو راضی برضا رہنا چاہیے اور اپنی حالت کو بدلنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

جبریہ کا یہ نقطۂ نظر اصلاحِ احوال کی ہر کوشش کی راہ میں سنگِ گراں کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر اس کو اپنا لیا جائے تو معاشرے سے ظلم و جور کا خاتمہ کر کے وہ مطلوبہ اجتماعی انصاف حاصل نہیں ہو سکتا جو انسانی زندگی کے تحفظ و بقا کے لیے ضروری ہے۔ دولتمند طبقہ اس نظریے کو اپنے خبثِ باطن کے سبب رواج دیتا ہے، فقیر و تنگدست محض جہالت اور دھوکے سے اسے قبول کرتا ہے اور بعض متدیّن لوگ غفلت یا منافقت کے سبب اس نقطۂ نظر کی رَو میں بہ رہے ہیں۔

نزولِ قرآن کے وقت یہ نظریہ اُس وقت کے معاشرے میں موجود تھا اور قرآن مجید نے اس کو صریح گمراہی سے تعبیر کیا۔ فرمانِ الٰہی ہے:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنُطْعِمُ مَن لَّوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا فِي	اور جب کہا جاتا ہے ان سے کہ خرچ کرو اُس میں سے جو رزق دیا اللہ نے تم کو۔ تو کہتے ہیں کافر لوگ اُن سے جو ایمان لاتے ہیں کیا ہم کھلائیں اس کو کہ اگر

ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ۔ (سورۂ یٰس : ۴۷) اللہ چاہتا تو کھلا سکتا تھا اس کو۔ تم تو صریح گمراہی میں ہو۔

واقعی اس سے بڑھ کر صریح گمراہی اور کیا ہو گی کہ خود غرض لوگ مشیتِ الٰہی کو اپنی اندھی خواہشات نفسانی کے لیے بہانا بنانا چاہیں۔ اُن کی رائے میں اگر اللہ تعالیٰ کسی نادار اور محتاج کو کھلانا چاہے تو اس کے لیے آسمان سے روٹی اور سالن یا گھی اور شہد اُتارے۔ اگر وہ عقل و انصاف سے کام لیتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے رزق دیتا ہے اور اگر ایک صاحبِ حیثیت آدمی کسی محتاج و بیکس کی ضرورت پوری کرتا ہے تو وہ درحقیقت مشیتِ الٰہی ہی سے ایسا کرتا ہے۔

اسلام اس حقیقت کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ ہر پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلے کا اس کائنات میں ایک حل موجود ہے۔ جس ذاتِ بے ہمتا نے بیماری کو پیدا کیا ہے اُسی نے دوا بھی پیدا فرمائی ہے۔ جس نے مرض کو پیدا کیا ہے اُسی نے علاج بھی پیدا کیا ہے۔ مرض بھی اللہ ہی کی تقدیر سے ہے اور علاج بھی۔ اور ایک سچا مومن تقدیرِ الٰہی کی مدد ہی سے تقدیرِ الٰہی کو ٹالتا ہے جیسے بھوک کو غذا سے اور پیاس کو پانی وغیرہ سے دُور کرتا ہے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ وبا سے بچنے کے لیے اپنے ساتھیوں کو لے کر شام سے واپس آئے تو اُن سے کہا گیا "اے امیر المومنین! کیا تقدیرِ الٰہی سے بھاگتے ہیں؟" آپ نے فرمایا "ہاں، ہم تقدیرِ الٰہی سے تقدیرِ الٰہی کی طرف بھاگتے ہیں"۔ اس واقعہ سے بھی پہلے ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دواؤں اور تعویذوں کے متعلق پوچھا گیا کہ کیا ان میں سے کوئی تقدیرِ الٰہی کو کچھ بھی ٹال سکتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا "یہ بھی تو تقدیرِ الٰہی سے ہیں"۔ پس جب فقر و فاقہ ایک بیماری ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کی دوا بھی پیدا فرمائی ہے۔ فقر و فاقہ اگر تقدیرِ الٰہی سے ہے تو اس کا مقابلہ کرنا اور اس سے چھٹکارا پانا بھی تقدیرِ الٰہی سے ہی ہے۔

قناعت کی حقیقت جہاں تک اُن احادیث کا تعلق ہے جن میں قناعت اور راضی برضا رہنے کی ترغیب ہے ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تنگدست و محتاج لوگ ذلت و ناداری کی زندگی پر راضی ہو جائیں نہ ان کا مطلب یہ ہے کہ وہ حلال دولت، خوشحالی اور آرام دہ زندگی کے حصول کی کوشش بالکل چھوڑ

دیں اور نہ ان کا مطلب یہ ہے کہ دولت مندوں کو اپنے عیش و تنعّم میں پڑا رہنے دیا جائے کہ دولت کا بے جا استعمال کر کے خوب دادِ عیش دیں۔

رسولِ خُدا صلی اللہ علیہ وسلّم اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے ہوئے تقویٰ کے ساتھ ساتھ خوشحالی بھی مانگا کرتے تھے۔ آپ نے اپنے خادم حضرت انس رضی اللہ عنہ کے لیے یوں دُعا کی تھی: اَللّٰھُمَّ اَکْثِرْ مَالَهٗ (اے اللہ! اس کو مالِ فراواں دے!)۔ اور اپنے ساتھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا تھا: "ما نفعنی مالٌ کمالِ ابی بکر (مجھے ابوبکرؓ کے مال کی طرح کسی کے مال نے فائدہ نہیں پہنچایا)۔ آنحضور صلعم کے ان ارشادات کے پیشِ نظر پھر قناعت کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟

ہمارے خیال میں قناعت سے مُراد مندرجہ ذیل دو باتیں ہیں:

(۱) انسان طبعًا لالچی اور دُنیا کا حریص ہے۔ وُہ دنیاوی مال و متاع سے کبھی سیر نہیں ہوتا۔ حدیثِ نبویؐ میں انسان کی اس کیفیت کو یُوں بیان فرمایا گیا ہے: "اگر ابنِ آدمؑ کو سونے کی دو وادیاں مل جائیں تو وہ تیسری کی خواہش کرے گا۔ اور اگر تیسری بھی مل جائے تو وہ ایک چوتھی کی خواہش کرے گا۔ ابنِ آدم کا پیٹ تو صرف مٹی ہی بھر سکتی ہے"۔ (یعنی زیرِ خاک جانے کے بعد ہی حرص و آز کا یہ سلسلہ ختم ہو سکتا ہے)۔ دین کا کام یہ ہے کہ وہ انسان کی طلبِ دولت میں اعتدال پیدا کرے اور طلبِ رزق میں حلال ذرائع اختیار کرنے کی طرف رہنمائی کرے۔ دین ہی انسان کی زندگی میں ایک توازن پیدا کرتا ہے اور اس کو سکون و اطمینان سے ہم کنار کرتا ہے۔ وہ اس کو افراط و تفریط سے محفوظ رکھتا ہے جو انسانی رُوح اور بدن دونوں کو کمزور کر دیتے ہیں۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے: "جبریل امین علیہ السلام نے میرے دل میں یہ بات ڈالی کہ کوئی شخص اس وقت تک ہرگز نہیں مر سکتا جب تک کہ اس کا دانہ پانی پُورا نہ ہو جائے۔ لہٰذا خدا تعالیٰ سے ڈرو اور طلبِ رزق میں حلال ذرائع اختیار کرو"۔

اگر انسان کو حرص و آز کے میلانات کا تابع بن کر رہنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے تو وُہ نہ صرف اپنے لیے بلکہ سارے معاشرے کے لیے ایک مستقل خطرہ بن جاتا ہے۔ لہٰذا ناگزیر ہے کہ اس کے میلانِ طبع کو بلند ترین اقدار، ابدی حقیقتوں اور دائمی رزق کی طرف موڑ دیا جائے۔ یہ کام

صرف دین ہی کر سکتا ہے۔ فرمانِ خداوندی ہے:

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ۔ (سورۂ طٰہٰ: ۱۳۱)

اور نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو دنیاوی زندگی کی اُس شان و شوکت کی طرف جو ہم نے ان میں سے مختلف لوگوں کو دے رکھی ہے۔ وہ تو ہم نے انہیں آزمائش میں ڈالنے کے لیے دی ہے اور تیرے رب کا دیا ہوا رزقِ حلال ہی بہتر اور پائندہ تر ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الْمَآبِ۔ قُلْ أَؤُنَبِّئُكُم بِخَيْرٍ مِّن ذَٰلِكُمْ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا عِندَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَأَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ۔ (آلِ عمران: ۱۴، ۱۵)

لوگوں کے لیے مرغوباتِ نفس، عورتیں، اولاد سونے، چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں، بڑی خوش آئند بنا دی گئی ہیں مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں۔ حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے۔ کہو: میں تمہیں بتاؤں کہ ان سے زیادہ اچھی چیز کیا ہے؟ جو لوگ تقویٰ کی روش اختیار کریں اُن کے لیے اُن کے رب کے پاس باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہاں انہیں ہمیشگی کی زندگی حاصل ہوگی۔ پاکیزہ بیویاں ان کی رفیق ہوں گی اور اللہ کی رضا سے وہ سرفراز ہوں گے۔ اور اللہ بندوں کے حال پر نگاہ رکھتا ہے۔

ایمان کا یہ کام ہے کہ وہ دلوں کو مذہب کی ابدی اقدار، باقی رہنے والے دارِ آخرت اور اللہ حی و قیوم کی طرف متوجہ کر دے اور مومن کو یہ تعلیم دے کہ تونگری کثرتِ مال و متاع میں نہیں بلکہ دل کی دولت میں ہے۔ جیسا کہ حدیثِ نبویؐ میں وارد ہے۔ لَيْسَ الْغِنَىٰ عَنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ، إِنَّمَا الْغِنَىٰ غِنَى النَّفْسِ، یعنی تونگری بدل است نہ بمال۔

قناعت اور مال و دولت کی تقسیمِ الٰہی پر راضی رہنے سے مُراد یہ ہے کہ لوگوں کا رزق میں ایک

دوسرے پر تفوّق صلاحیتوں اور قابلیتوں میں تفوّق و برتری کے مانند ہے اور یہ بات اس دنیاوی زندگی کے مزاج و فطرت اور اس میں انسان کے اعمال و فرائض کا تقاضا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو ارادہ و اختیار کی قوت دے کر اُسے ابتلاء و امتحان میں ڈالا ہے اس کا بھی یہ تقاضا ہے کہ انسانوں میں فرقِ مراتب ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ (النحل ۷۱)	اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت عطا کی ہے۔
اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ، اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا (بنی اسرائیل ۳۰)	تیرا رب جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے وہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور انہیں دیکھ رہا ہے۔
وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ۔ (الانعام: ۱۶۵)	وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں زیادہ بلند درجے دیئے۔ تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔

جس طرح انسانوں میں بعض پست قد ہیں اور بعض دراز قد، بعض بدصورت ہیں اور بعض خوب صورت، بعض کُند ذہن ہیں اور بعض زیرک اور بعض کمزور ہیں اور بعض طاقتور، اسی طرح بعض تنگ دست ہیں اور بعض کشادہ رزق۔ یہ زندگی کے مزاج و فطرت کے مطابق ہے اور یہ سُنت اللہ ہے جسے کمیونسٹ بالکل نہیں بدل سکے باوجود اس کے کہ وہ انسانوں کے درمیان معاشی و اقتصادی اُونچ نیچ کو ختم کر کے مساوات قائم کر دینے کے بارے میں بڑے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں۔

اسلام کی تعلیم قناعت کا مقصود اسلام کا مقصد مسلمان کو حقیقت پسند بنانا ہے کہ وہ زندگی کو ویسی ہی سمجھے جو وہ ہے اور کسی جھوٹے وہم میں پڑ کر اپنی زندگی کو غم و اندوہ اور مصائب و آلام میں مبتلا

نہ کرے۔ نیز اسلام چاہتا ہے کہ مسلمان دوسرے کے مال و دولت کی طرف کسی ایسے حاسد کی نگاہ سے نہ دیکھے جس کے دل کو حسد کی آگ کھا رہی ہو، جس کا سینہ عداوت و نفرت کے جذبات سے اُبلا پڑ رہا ہو اور جس کے دل میں حرص و آز موجزن ہو۔ کیونکہ دوسرے کے مال و متاع کی طرف یوں دیکھنا شقاوت و بدبختی کو دعوت دیتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ انسان پہلے اُن بہت سی نعمتوں پر نگاہ ڈالے جن سے اُسے سرفراز کیا گیا ہے، پھر اپنے سے کم تر انسان کی طرف دیکھے جو ان نعمتوں سے محروم ہے، تاکہ اُسے خوشی و مسرت کے ساتھ ساتھ اطمینانِ قلب بھی نصیب ہو۔

"قناعت کا مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ کے عطا کردہ رزق پر راضی ہو جائے۔ اور جو اُسے میسر نہیں آسکتا اُس کی خواہش نہ کرے اور نہ اس چیز پر نگاہ رکھے جو دوسروں کو عطا کی گئی ہے۔ میسر نہ آسکنے والی شے کی خواہش کرنا بالکل ایسا ہے جیسے کوتی پیر فرتوت جوانی کی خواہش کرے یا کوئی بدصورت عورت کسی خوبصورت عورت کو حسد کی نگاہ سے دیکھے یا کوئی ٹھنگنا کسی لمبے قد کے آدمی کو حسرت و حسد سے دیکھے یا کوئی بے آب و گیاہ قطعہ ارضی پر رہنے والا بدو خوشحالی اور ناز و تنعّم کی زندگی بسر کرنے کی خواہش رکھے وغیرہ۔ عہدِ نبویؐ میں بعض عورتوں نے یہ خواہش کی تھی کہ اُن کے بھی وہی حقوق ہونے چاہئیں جو مردوں کے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل آیت نازل فرمائی تھی۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَاسْـئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ۔ (سورۃ النساء: ۳۲)	اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ دیا ہے اس کی تمنا نہ کرو جو کچھ مردوں نے کمایا ہے اس کے مطابق اُن کا حصہ ہے۔ اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ۔ ہاں اللہ سے اس کے فضل کی دعا مانگتے رہو۔

عسرت و تنگ دستی کی حالت میں جس سے افراد دوچار ہو جاتے ہیں اور جنگ اور قحط کے پیدا کردہ ہنگامی بحرانوں میں جن سے قومیں دوچار ہوتی ہیں اور اُن ممالک اور ریاستوں میں جہاں لوگوں کی فلاح و

بہبود کے لیے قدرتی وسائل کی کمی ہوتی ہے اور لوگ اپنے رزق کو بڑھانے کا کوئی ذریعہ نہیں پاتے، قناعت ہی ایک مؤثر دوا اور شفابخش مرہم ثابت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ناممکن الحصول چیز کی تمنا اور بے ثمر حرص وآز الٹا انسانی طبیعت کو غم والم کی آماجگاہ بنا دیتی ہے۔ ایسے لالچی اور حریص لوگوں کو یہ جاننے اور اس پر یقین کرنے کی ضرورت ہے کہ خوش حالی دنیاوی ساز وسامان کی زیادتی میں نہیں بلکہ یہ نفسِ انسانی کے اندر ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ "دنیاوی مال ودولت اور ساز وسامان کی خدائی تقسیم پر راضی ہو جاؤ تم غنی ترین انسان بن جاؤ گے"۔ ایک دوسری حدیث میں ارشادِ نبوی ہے: "جو مسلمان ہو گیا اور اس کے پاس گزارے کے لیے روزی ہے اور وہ اس پر راضی ہو گیا (یا قانع ہو گیا) تو وہ یقیناً فلاح پا گیا"۔ مَا قَلَّ وَكَفٰى خَيْرٌ مِّمَّا كَثُرَ وَاَلْهٰى (حسبِ ضرورت تھوڑی چیز اس زیادہ سے بہتر ہے جو بہت ہو مگر آدمی کو غفلت میں مبتلا کر دے)۔

فرمانِ خداوندی ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً۔

جو شخص بھی نیک عمل کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس آیت میں پاکیزہ زندگی کو قناعت کی زندگی سے تعبیر کیا ہے۔

انفرادی احسان کا نظریہ اور اسلام | اسلام اگرچہ اہلِ ثروت کو صدقہ وخیرات کی دعوت دینے، کمزوروں کی غم گساری پر ابھارنے اور فقر وفاقہ میں مبتلا افرادِ معاشرہ کی طرف دستِ اعانت بڑھانے کی ترغیب دینے میں بظاہر تیسرے گروہ یعنی انفرادی احسان کے حامیوں کا ہم نوا نظر آتا ہے، مگر وہ اس بات کا ہرگز قائل نہیں ہے کہ محض انفرادی صدقہ واحسان پر انحصار کر کے معاشرے کے تنگ دست اور نادار افراد کو اہلِ ثروت کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جائے۔ خاص طور پر انفرادی احسان ایسے حالات میں تو بالکل ہی ناقابلِ اعتماد ہو جاتا ہے جبکہ دل سخت اور ایمان کمزور ہو گئے ہوں اور ذہن وضمیر پر حرص وآز اور انانیت کا غلبہ ہو، اور مال کی محبت اہلِ مال کے نزدیک اللہ اور اس

کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے بھی بڑھ گئی ہو۔ دورِ جاہلیت کا معاشرہ کچھ اسی قسم کا ہو چکا تھا جسے قرآنِ مجید نے یوں مخاطب فرمایا ہے:

كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا۔ (الفجر ۲۱-۱۸)

ہرگز نہیں بلکہ تم عزت نہیں کرتے یتیم کی اور ترغیب نہیں دیتے مسکین کو کھانا کھلانے کی، اور میت کا ترکہ سب سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال سے بہت زیادہ محبت کرتے ہو۔

ڈاکٹر ابراہیم لبان نے محتاجوں اور ناداروں کے حقوق پر بحث کرتے ہوئے انفرادی احسان کا یوں تجزیہ کیا ہے:

"انفرادی احسان کا یہ تصور وہ قدیم ترین ذریعہ ہے جسے سارے آسمانی مذاہب سوسائٹی میں فقر و فاقہ کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں اور انسانیت تنگ دستی و عسرت کا مقابلہ کرنے اور فقراء و مساکین کی امداد کرنے کے لیے جس پر ایک لمبے عرصہ تک انحصار رکھتی رہی ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ یہ انفرادی احسان باوجود اپنی ہزار خوبیوں کے فقر و فاقہ کی مکمل طور پر بیخ کنی نہیں کر سکا اور ناداروں اور محتاجوں کی زندگی کو اس حد تک بلند نہیں کر سکا کہ اُسے ایک باعزت انسانی زندگی کہا جا سکے۔ اندریں حالات یہ ضروری ہے کہ ہم انفرادی احسان کے اس تصور کی حقیقت معلوم کریں اور اس کے خصائص سے آگاہی حاصل کریں اور اس کے نقائص کی نشاندہی کریں تاکہ ہمارے لیے ان اسباب کو گننا آسان ہو جاتے جو معاشرے کو فقر و فاقہ کی برائیوں سے پاک کرنے میں اس تصور کی ناکامی کے باعث ہوئے ہیں۔

زندگی میں واجب امور کی عام طور پر دو قسمیں سمجھی جاتی ہیں۔ ایک فرض، دوسری حق خرید و فروخت کے معاملہ میں کسی فروخت کردہ یا خرید کردہ شے کی قیمت خریدنے والے پر فرض ہوتی ہے جس کی ادائیگی ضروری ہے مگر وہی قیمت بیچنے والے کا حق ہوتی ہے

جس کا وہ مطالبہ کر سکتا ہے اور مندرجۂ ذیل دو عوامل اس کے اس حق کی تقویت کا باعث ہوتے ہیں۔

ایک یہ کہ اس حق کے پیچھے ایک مطالبہ کرنے والا موجود ہوتا ہے جو اس کو طلب کر سکتا ہے اور اُسے ضائع ہونے یا نظرانداز کر دیئے جانے سے محفوظ رکھتا ہے۔

دوسرے یہ کہ حکومتِ وقت خود اپنی ذمّہ داری سمجھتی ہے کہ حقدار کو اس کا حق پہنچائے۔

ہم پورے وثوق سے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ باہمی لین دین کے معاملے میں کامیابی کا ضامن ادائیگی قرض کے تصوّر کے ساتھ حق کو حقدار تک پہنچانے کا تصور بھی ہے۔ معاشی لین دین کے معاملے میں صرف فرض کی ادائیگی کا تصوّر کبھی کامیابی کا ضامن نہیں ہو سکتا۔

واجب امور کی مذکورۂ بالا بحث کو سمجھے بغیر انفرادی احسان کے تصوّر کو سمجھنا مشکل ہے۔ انفرادی احسان کو اکثر لوگ دینے والے کا فرض تو سمجھتے ہیں مگر لینے والے کا حق نہیں سمجھتے۔ اسی لیے جس زمانے میں انفرادی احسان کا تصوّر رائج تھا، محتاج و تنگدست اس شعور سے بالکل عاری تھا کہ مالدار پر اس کا کوئی حق ہے جس کا وہ مطالبہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ بہت سے مالدار لوگ اس کو بالکل نظرانداز کر دیتے تھے، بغیر اس کے کہ فقراء و مساکین اپنے حق کا مطالبہ کریں یا حکومت وقت اُن کے اس حق کو حاصل کر کے اُن تک پہنچائے۔"

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مذکورۂ بالا بحث میں اس بات کا اضافہ کر دیا جائے کہ انفرادی احسان میں وہ ضروری شرائط موجود نہیں ہیں جو حکومتِ وقت کی اِس معاملے میں دخل اندازی کے لیے درکار ہوتی ہیں۔ حکومت واضح شرائط کے تحت ایک مقرّرہ رقم بطور ٹیکس وصول کر سکتی ہے مگر وہ انفرادی احسان وصول نہیں کر سکتی۔ اس لیے کہ اس میں کوئی مقرّرہ مقدار نہیں ہوتی اور نہ اس بات کی کوئی وضاحت ہوتی ہے کہ کس پر انفرادی احسان واجب ہے اور کب واجب ہے؟ یوں انفرادی احسان کی حیثیت محض ایک ایسے فرض کی رہ گئی جو اتنی قوت نہیں رکھتا تھا کہ غریبوں اور محتاجوں کا حق کہلا سکے۔ کیونکہ نہ اُس کی کوئی مقدار تھی اور نہ حکومتِ وقت اُسے جمع کر کے مستحقین میں تقسیم کرنے کا اختیار رکھتی تھی۔ دولتمند طبقہ بجائے خود اگر اپنی ذمّہ داری سمجھ کر غرباء و مساکین کی مدد کر دے تو معاملہ ٹھیک ہو جاتے ورنہ نہیں۔ مگر انسان طبعی طور پر مال سے محبت رکھتا ہے اور اس کو خرچ کرنے سے گریز کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ آہستہ آہستہ انفرادی احسان کو بالکل

مطبُوعات

پاکستان میں آئین کی تدوین اور جمہوریت کا مسئلہ | تالیف: پروفیسر خورشید احمد صاحب۔ شائع کردہ: مکتبہ معاویہؓ ۱۱/۲ بی ون ایریا لیاقت آباد کراچی۔ صفحات: ۳۶۸ قیمت: چھ روپے۔

کتاب کے فاضل مصنّف کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ گذشتہ دس بارہ سالوں میں انھوں نے اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اتنا زیادہ اور اتنا جاندار لکھا ہے کہ ان کی علمی اور دینی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ زیرِ تبصرہ کتاب ان کے ان فکر انگیز ادارتی مقالات کا مجموعہ ہے جو وہ معروف ماہنامہ "چراغ راہ" کے لیے لکھتے رہے۔ ان مقالات میں ایک مقصدی ترتیب اور معنوی ربط پایا جاتا ہے۔ اور یہ سارے مضامین پاکستان میں آئین اور دستور کے مسائل اور خصوصاً اسلامی آئین کے نفاذ اور اس راہ کی مشکلات سے بحث کرتے ہیں۔ مصنف کا اندازِ بیان بڑا وقیع اور عالمانہ ہونے کے باوجود بڑا شگفتہ اور دلچسپ ہے اور کہیں بھی پڑھتے ہوئے اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔

ان مقالات کے ابتدائی حصوں میں اسلام کے نظریۂ سیاسی، اسلام میں دین و سیاست کی یکجائی پر بھی نہایت نپے تلے انداز میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

کتاب کے آغاز میں پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب نے ہندوستان میں انگریز کی آمد اور اس کے تسلّط سے لے کر پاکستان کے قیام تک کے حالات کو ایک مسلمان مُبصر کی حیثیت سے نہایت اچھے انداز میں بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ فرنگی کی عملداری سے مسلمانوں کو بحیثیت ایک ملّت کس قسم کے

(بقیہ: فقر و فاقہ اور اس کا اسلامی حل)

چھوڑ گئے اور غربا و مساکین بدحالی اور محتاجی کی اُس حالت کو پہنچ گئے کہ سارے اجتماعی نظام میں اُن کی مدد یا کفالت کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔ اندریں حالات مجرد انفرادی احسان کو فقر و فاقہ کے مسئلے کا کوئی مکمل حل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ (باقی)

نقصانات اٹھانے پڑے اور وہ اس کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے کیا کچھ کرتے رہے۔ قادری صاحب نے یہ مقالہ لکھ کر پروفیسر خورشید صاحب کے مضامین کے لیے ایک نہایت صحیح پس منظر مہیا کر دیا ہے جس کی روشنی میں پاکستان کے اندر اسلامی آئین کے نفاذ کی جدوجہد کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ پروفیسر خورشید صاحب چونکہ اس جدوجہد میں عملی طور پر شریک رہے ہیں اس لیے ان کے مقالات میں حقیقت پسندی کی جھلک پوری طرح نمایاں ہے۔ یہ سلسلہ مضامین بڑا مفید ہے اور اسلامی آئین کے نفاذ میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس سے کافی رہنمائی حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ اس جدوجہد کی نہایت قابل اعتماد دستاویز ہے جس سے پاکستان کا مورخ کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ معیارِ طباعت و کتابت گوارا ہے۔ کاغذ البتہ ناقص ہے۔

خلافت و ملوکیت اور علمائے اہل سنت تالیف: مرتبہ جناب ابو خالد صاحب۔ شائع کردہ: مکتبہ اہل سُنّت، چاہ میراں، لاہور۔ قیمت: ۲ روپے۔ صفحات: ۱۵۲

اس کتاب میں فاضل مصنف نے بڑے ٹھوس دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ مولانا مودودی کی کتاب "خلافت و ملوکیت" کے جن پہلوؤں پر بعض لوگوں نے فتنہ کھڑا کیا ہے ان میں سے کوئی ایک پہلو بھی ایسا نہیں جس پر اُمت کے معتمد علماء نے اظہارِ خیال نہ کیا ہو۔ اُن کے نقطہ نظر اور مولانا مودودی کے نقطہ نظر میں کوئی بنیادی اختلاف نظر نہیں آتا۔ پھر وہ اگر ان خیالات کی بنا پر موردِ الزام نہیں ٹھہرتے تو مولانا مودودی پر آخر یہ خاص "کرم فرمائی" کیوں کی جاتی ہے۔

کتاب کا معیارِ طباعت اور کتابت عمدہ ہے۔

AID OR TRADE معاونت یا تجارت تالیف: جناب یوسف حسن شیرازی صاحب۔ ملنے کا پتہ: شیرازی انوسٹمنٹ لمٹیڈ F/36، S.I.T.E کراچی۔ قیمت: پاکستانی سکے میں، ۸ روپے غیر ملکی سکے میں۔ ۲٫۵۰ ڈالر۔

کتاب کے مصنف ملک کے ایک اونچے درجے کے تاجر اور صنعت کار ہونے کی وجہ سے ملکی معیشت کے بارے میں نہایت وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے نہ صرف ملک کی

معاشی صورتِ حال پر تبصرہ کیا ہے۔ بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ اسے اگر بہتر بنانے کے لیے سر توڑ کوشش نہ کی گئی تو ملک کو شدید نقصان پہنچے گا۔ ان کا موقف یہ ہے کہ ہمیں اپنی معیشت کے اندر تنوّع پیدا کرنا چاہیئے اور اس مقصد کے لیے پیدائشِ دولت کی ہیت میں بھی تنوع پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

غیر ملکی قرضوں کے بارے میں فاضل مصنّف کا جائزہ بڑا ناقدانہ اور فکر انگیز ہے۔ انہوں نے یہ بتایا ہے کہ یہ مشروط نوعیت کے غیر ملکی قرضے پس ماندہ اور ترقی پذیر ممالک کے لیے کچھ زیادہ مفید ثابت نہیں ہو رہے بلکہ ان کا بیشتر فائدہ اُن ممالک کو پہنچتا ہے جو "امداد" کے نام پر یہ قرضے دیتے ہیں۔ کتاب بڑی دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ خصوصاً معاشیات کے طلبار اور اس سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس میں بڑی کام کی باتیں موجود ہیں۔

معیارِ طباعت و کتابت خاصا اونچا ہے۔

خدائی وعدہ تالیف: ڈاکٹر طٰہٰ حسین۔ ترجمہ: جناب معراج محمد بارق صاحب۔ ناشر: نور محمد کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ کراچی۔ قیمت

زیر تبصرہ کتاب ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی معروف کتاب "الوعدالحق" کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں فاضل مصنّف نے حضرت عمار بن یاسر، حضرت بلال حبشی، حضرت صہیب رومی اور حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہم جیسے بے بس صحابہ کے مصائب و شدائد کو بیان کیا ہے جو انہوں نے کفارِ مکہ کے ہاتھوں اسلام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستگی کی خاطر برداشت کیے۔ اس کتاب میں طٰہٰ حسین کے اسلوبِ نگارش یعنی الفاظ کے شکوہ، مترادفات کے کثرتِ استعمال کے ساتھ ساتھ تصویر کشی کا رنگ بھی نمایاں ہے۔ اس کے پڑھنے سے ان مقدس ہستیوں کی مظلومیت سامنے آجاتی ہے۔ جنہوں نے اللہ کے دین کو بلند کرنے کے لیے غیر معمولی پامردی اور استقامت کا ثبوت دیا اور جو معاشرے میں کمزور ہونے کی وجہ سے خاص طور پر کفار کے ظلم و استبداد کا تختہ مشق بنتے رہے۔

کتاب کا ترجمہ بڑا جاندار ہے۔ اس میں الفاظ کی ترجمانی کے ساتھ جذبات کی ترجمانی موجود ہے۔

معیار طباعت و کتابت گوارا ہے۔

انقلاب ایران بیسوی صدی میں تالیف: جناب نظیر حسین زیدی ایم اے۔ ناشر: مسعود اکادمی ڈی ۲/۲۳ ناظم آباد ۳۔ کراچی۔

اس کتاب میں اُس انقلاب کی داستان بیان کی گئی ہے جسے "انقلاب مشروطیت ایران" کہا جاتا ہے اور جس کے بعد نہ صرف ایران کی سیاسی ہیئت میں تبدیلی ہوئی بلکہ اس کی معیشت اور معاشرت میں بھی نمایاں تبدیلیاں ہوئیں۔

اُندلس، ادب و تاریخ تالیف: ڈاکٹر سید محمد یوسف پروفیسر عربی جامعہ کراچی۔ شائع کردہ: مدینہ پبلشنگ کمپنی بندر روڈ کراچی ۱۔ صفحات: ۱۵۹۔ قیمت: چھ روپے۔

اس کتاب کے مصنف عربی زبان اور ادب کے نامور عالم ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے اندلس کے معروف مورخین کی انشا پردازی کے نمونے فتح ۹۱ھ سے لے کر سنہ ۸۹۷ھ تک پیش کیے ہیں۔ ان کے مطالعے سے نہ صرف ایک عظیم اسلامی ملک میں اظہارِ خیال کے مختلف اسلوب سامنے آئے ہیں بلکہ تاریخی واقعات کی مختلف کڑیاں معلوم ہونے سے اُن کے ارتقاء کا ایک نقشہ بھی ذہن میں مرتب ہو جاتا ہے۔

فاضل مصنف نے ہر واقعہ کے بیان سے پہلے اس کا جو مختصر پس منظر پیش کیا ہے اس سے اُسے سمجھنے میں بہت زیادہ مدد ملتی ہے۔ عربی زبان کے ذوق کو عام کرنے کے لیے یہ سلسلہ بڑا مفید ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب اس سلسلے کو جاری رکھیں گے۔

معیارِ کتابت و طباعت عمدہ ہے۔

اسلامی اسباق شائع کردہ: ادارۂ درس و اشاعت اسلام رجسٹرڈ۔ لاہور قیمت ۴۰ پیسے صفحات ۶۴۔

بچوں کو دینی تعلیمات سے روشناس کرانے کے لیے یہ ایک قابلِ قدر کوشش ہے۔ اس کے دائرے کو جس قدر پھیلایا جائے اس قدر اس سے مفید نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

معیارِ طباعت و کتابت عمدہ ہے۔

(بقیہ اشارات)

دنیوی عزت و جاہ سے کہیں زیادہ اصول عزیز ہوتے ہیں۔

(ب) جب اس طبقے کے لوگ کسی بات کے قائل ہو جاتے ہیں تو پھر وہ عملی جد و جہد سے گریز نہیں کرتے بلکہ اس کو آگے بڑھانے کے لیے پوری قوت کے ساتھ سرگرمِ عمل ہو جاتے ہیں اور اس راہ کی ساری مشکلات اور موانع کو بڑے صبر و ثبات سے برداشت کرتے ہیں۔

(ج) اس طبقہ کی تیسری بڑی نشانی یہ ہے کہ اس کے افراد کے ساتھ تبادلۂ خیالات کرتے ہوئے ان کی گفتگو اور کسی مسئلہ کے بارے میں ان کے اندازِ استفسار سے اس امر کا صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کے اندر حق کو سمجھنے اور اس کا ساتھ دینے کی طلبِ صادق موجود ہے اور وہ اپنے ذہنوں کو اس معاملے میں یکسو کرنا چاہتے ہیں۔ وہ خود اپنے ذہن میں اُلجھنیں پیدا نہیں کرتے بلکہ جو الجھنیں فی الحقیقت موجود ہوں انہیں خلوصِ نیت کے ساتھ دُور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی گفتگو طنز و تعریض سے یکسر پاک ہوتی ہے

(د) یہ افراد صرف اسی وقت تک رُکے رہتے ہیں جب تک انہیں ایک بات کے حق ہونے کا اطمینان نہیں ہو جاتا۔ اطمینان ہو جانے کے بعد ان کا طرزِ عمل یکسر بدل جاتا ہے اور حق و باطل کے معاملہ میں تماشائی کا کردار ادا کرنے سے ان کی فطرت انکار کر دیتی ہے۔

(ھ) پھر سیرت و کردار کے اعتبار سے بھی یہ لوگ بڑے پُختہ ہوتے ہیں اور اپنی مضبوط سیرت کی وجہ سے معاشرے میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ خیانت، نفاق اور مکر و فریب سے ان کی زندگیاں بالعموم پاک ہوتی ہیں اور ان کے طرزِ عمل کو دیکھنے سے اس امر کا صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ کسی اعلیٰ و ارفع نصب العین کی محبت سینے میں لے کر زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

مندرجۂ بالا صفات سے متصف افراد کسی تحریک کے لیے سب سے زیادہ مفید اور کارآمد ہوتے ہیں۔ ان کی جس قدر زیادہ تعداد کسی جماعت کو میسر آ سکے گی یا کسی نصب العین کی علمبردار ہو گی اسی نسبت سے اس جماعت کو قوت فراہم کرے گی اور وہ نصب العین دنیا میں سر بلند ہو گا۔ لہٰذا ہمارے رفقاء کو ان صفات کے حامل افراد کی طرف سب سے زیادہ توجہ دینی چاہیے۔

اس حق پسند طبقے کے مقابلے میں جماعت کے بہی خواہوں کو اپنی قوتیں اُس طبقے پر کم از کم خرچ کرنی چاہییں جسے دنیا پرستی، حسد، نفاق اور ایسے ہی دوسرے اخلاقی عوارض نے بالکل ناکارہ کر دیا ہے۔ اس طبقے کی بھی بعض مخصوص نشانیاں ہیں جن سے وہ پہچانا جا سکتا ہے۔

(ا) اس طبقے کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ اس کے افراد صحیح بات معلوم کرنے کے بجائے غلط باتیں ڈھونڈھنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں، اور اگر غلط بات نہ ملے تو صحیح کو غلط بنانے میں بھی تامّل نہیں کرتے۔ اگر ان سے گفتگو کی جائے تو چند لمحوں میں یہ راز کھل جاتا ہے کہ یہ جھگڑالو لوگ ہیں۔ کوئی مسئلہ سمجھنا نہیں چاہتے بلکہ اُلجھنا اور اُلجھانا چاہتے ہیں۔ جھوٹ، الزام تراشی اور افترا پردازی ان کا دل پسند مشغلہ ہوتا ہے اور یہ اپنے مخالفین کو ہر طرح سے نیچا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

(ب) ان کا ذہن بڑا تخریب پسندانہ ہوتا ہے۔ یہ ہر اچھے کام کو بگاڑنے کے درپے رہتے ہیں مگر خود کوئی بھلائی کا کام کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ کسی معاشرے میں جہاں بھی کوئی اچھا کام ہو یہ اس میں ایک دوسرے سے بڑھ کر کیڑے نکالتے ہیں، اور خوردبین لگا لگا کر دوسرے کے عیب تلاش کرتے ہیں اور پھر انہیں بڑے زور و شور سے اچھالتے ہیں، اور اس طرح بھلائی کے کام کرنے والوں کو خوب رُسوا اور بدنام کرتے ہیں، مگر خود کوئی تعمیری کام کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ ان کا طرزِ فکر بڑا بے ڈھنگا طرزِ استدلال بڑا بھونڈا اور گفتگو کا انداز بڑا عامیانہ اور سُوقیانہ ہوتا ہے۔ پھر یہ احساسِ تناسب کے اس حسن سے بھی عاری ہوتے ہیں جس سے زندگی میں اعتدال پیدا ہوتا ہے۔ یہ لوگ اپنے مخالف کی ہر اچھی سے اچھی بات کے اندر ہزار نقائص پیدا کرتے ہیں اور اپنے ہم خیال لوگوں کے معائب پر نہ صرف پردہ ڈالتے ہیں بلکہ انہیں محاسن کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ انہیں حق و صداقت سے محبت نہیں ہوتی بلکہ اپنے جتھے سے وابستگی ہوتی ہے اور بالکل اندھے ہو کر اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ ان لوگوں کی ساری زندگیاں شر خار کو سلانے اور ان کی پگڑیاں اچھالنے میں گزر جاتی ہیں۔

جن لوگوں کے اندر یہ کمالات پائے جائیں ان کے لیے خدا سے دُعا تو کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت دے مگر کسی تعمیری کام کرنے والے آدمی کو اپنا قیمتی وقت ان کے ساتھ بحث و تمحیص میں ضائع نہ کرنا چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ جو وقت بھی خلوصِ نیت کے ساتھ راہِ خدا میں خرچ کرے گا وہ خدا کے ہاں اجر کا مستحق ہو گا، لیکن اگر یہی وقت کسی اچھے

اور بھلے آدمی کو سمجھانے میں صرف کیا جائے تو اس سے انشاء اللہ بہتر نتائج کی توقع ہو سکتی ہے۔

جہاں تک "خاموش اکثریت" کا تعلق ہے اس کے سامنے حق بات کو ایسی حکمت کے ساتھ پیش کرنا چاہیے کہ وہ اس اکثریت کے ان سب لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لے جو خیر پسند ہوں۔ کوئی معاشرہ جب تک بگاڑ کی انتہا کو نہ پہنچ جائے، اس کے عوام میں اکثریت دانستہ شر پسند نہیں ہوتی، بلکہ اس کی ہمدردیاں آخر کار انہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہیں جو اسے واقعی بھلائی کا کام کرتے نظر آتے ہیں۔ اگر معاشرے میں بھلائی ایک تحریک کی صورت میں کام کر رہی ہو تو عوام کا بڑا حصہ رفتہ رفتہ اس کا حامی و مددگار بنتا چلا جاتا ہے اور اس میں سے کام کے لوگ نکلتے چلے آتے ہیں۔ ممکن ہے ابتدائی مراحل میں یہ لوگ زیادہ جوش و خروش کے ساتھ تحریکِ اسلامی کے مددگار ثابت نہ ہو سکیں لیکن جوں جوں انہیں اپنے ساتھ آگے بڑھانے کی کوشش کی جائے گی اسی نسبت سے ان کے اندر عزم اور ارادے کی پختگی اور کام کرنے کا حوصلہ پیدا ہوگا جو انہیں جلد ہی تحریک کا سرگرم حامی اور بہتوں کو فعال کارکن بنا دیگا۔

اس کے بعد خاموش اکثریت کا وہ عنصر باقی رہ جاتا ہے جس کے افراد دنیوی مال و متاع اور عزّ و جاہ کے پجاری ہوتے ہیں اور اس بنا پر ہر چڑھنے والے سورج کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔ ان لوگوں کی وفاداریاں مفادات کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ جس گروہ یا جماعت سے ان کے مفادات وابستہ ہونگے یہ بہر طور اسی کا ساتھ دیں گے۔ ان کے اندر دین، ایمان، ضمیر، اخلاق جیسی پاکیزہ چیز نام کو بھی نہیں پائی جاتی۔ ان بے ضمیر لوگوں کو اپنا ہمنوا بنانے اور اپنے ساتھ لگانے کا آخر کیا فائدہ؟ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دینا چاہیے، کیونکہ نہ ان کو ہم اپنی طرف کھینچ سکتے ہیں، نہ ان کو کھینچ کر ہم کوئی فلاح پا سکتے ہیں۔

ضروری گذارش

خریداران ترجمان القرآن کی اطلاع کے لیے گذارش ہے کہ یکم جون ۱۹۷۰ء سے بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر پرچے کی قیمت میں حسبِ ذیل اضافہ کیا گیا ہے:

چندہ سالانہ آٹھ روپے ۔ قیمت فی پرچہ ۸۰ پیسے۔

مشرقی پاکستان (ہوائی ڈاک سے) " " ۹۰ پیسے۔ سالانہ ۱۰/- روپے ۔ (مینیجر)

اسلام کا نظریۂ حکمرانی

اور

سیاسی تصورات سمجھنے کے لیے

معیاری اور مستند کتابیں

۱۔ اسلامی ریاست — سید ابوالاعلیٰ مودودی	اعلیٰ ایڈیشن	۱۵/- روپے
	سستا ایڈیشن	۱۰/- روپے
۲۔ خلافت و ملوکیت	اعلیٰ ایڈیشن	۹/۲۵ روپے
	سستا ایڈیشن	۵/- روپے
۳۔ تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان	اعلیٰ ایڈیشن	۱۱/۲۵ روپے
	سستا ایڈیشن	۵/۵۰ روپے

اعلیٰ کتابت و طباعت پر معیاری پیش کش

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

۱۳۔ ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

۱۶۔ بیت المکرم (پہلی منزل) ڈھاکہ